دار الابلاغ
DARULIBLAGH

قلنا يا نار كوني بردا وسلاما على ابراهيم







سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پُرنور سیرت کا دل آویز اور ایمان افروز تذکرہ

سیرۃ سیدنا ابراہیم علیہ السلام

محمد رضی الاسلام ندوی

قلنا یٰنار کونی بردا وسلٰما علیٰ ابراہیم



سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پُر نور سیرت کا دل آویز اور ایمان افروز تذکرہ

سیرۃ سیدنا ابراہیم علیہ السلام

محمد رضی الاسلام ندوی

دار الابلاغ
DARULIBLAGH

دار الابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز لاہور پاکستان
فون: 0300-4453358

DARULIBLAGH

کتاب وسنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ

سیرۃ سیدنا ابراہیم علیہ السلام

تالیف.............................محمد رضی الاسلام ندوی

اعداد.............................محمد طاہر نقاش

اشاعت اول.............................ستمبر 2016ء

ترئین و آرائش
نون ڈیزائنر اینڈ پرنٹرز NOON Designer & Printers 0321-4167895 ,4503606

[illegible]

لاہور: دارالسلام شوروم 37232400 مکتبہ قدوسیہ 37230585 مکتبہ سلفیہ 37237184
کتاب سرائے 37320318 اسلامی اکیڈمی 37357587 نعمانی کتب خانہ 37321865 البلاغ 35717842
راولپنڈی: تجلیات طیبہ کشمیری بازار 5535168 مکتبہ عائشہ 5551014-0321-5075075
دارالفکر اسلامی 0321-5216287 اسلام آباد: المسعود اسلامک بکس 2261356 البلاغ 2281420
دارالسلام شوروم 0321-5370378 فیصل آباد: مکتبہ اہلحدیث 0300-6628021,041-2629292
سیالکوٹ: مکتبہ الاذان 0332-8787866 پشاور: معراج کتب خانہ 214720
حیدرآباد: مکتبہ دعوت التوحید 0333-2607264 کراچی: فضلی سنز 32212991

دارالابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
[illegible] اردو بازار لاہور فون: 0300-4453358, 042-37361428
daruliblagh0300@gmail.com

فہرستِ مضامین

تیسرا باب
ملتِ ابراہیم

چوتھا باب
اسوۂ ابراہیم علیہ السلام

پانچواں باب
سیرتِ ابراہیم علیہ السلام: چند شبہات کا جائزہ

حرفِ تمنا

سیرت سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اور ہم

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات پوری بنی نوع انسانیت کے لیے مشعل راہ ہیں۔ دین اسلام دین ابراہیم کی ہی دوسری شکل وتشریح ہے۔ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ کریم کے وہ بزرگ پیغمبر ہیں کہ جن کو ہر سال مسلمان باقاعدگی سے دو یا تین دن تک مسلسل یاد کرتے ہیں اور ان کے اسوۂ (ابراہیمی) پر عمل پیرا ہوکر قربانی کی سنت ادا کرتے ہیں۔ یوں ان کی زندگیوں میں اپنے پروردگار کی خاطر قربان ہوجانے اور کچھ کرجانے کا جذبہ پہلے سے شدت وتیزی سے پروان چڑھتا ہے اور وہ اپنے مولا کریم کو خوش کرنے کی کوششوں میں سرگرم ہوجاتے ہیں اور ہمہ وقت دین اسلام اور حاملین اسلام کے لیے قربان ہوجانے کے جذبات لے کر ایک بار پھر کارگاہ حیات میں مصروفِ عمل ہوکر آگے سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اللہ کریم کے اس اولوالعزم پیغمبر جناب سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی سیرت کی ضوفشانیوں سے فیض یاب ہونے کے لیے ابھی تک اردو زبان میں کوئی خاص مستند وجامع کتاب نہ مل رہی تھی۔ اس موقع پر دارالابلاغ کو یہ سعادت حاصل ہورہی ہے کہ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پُرنور سیرت مستند انداز میں اہل پاکستان کے سامنے پیش کررہا ہے۔ اس کتاب میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے متعلق اٹھائے گئے کچھ اعتراضات وغلط فہمیوں کی تسلی وتشفی بھی کردی گئی ہے۔ یوں اس کتاب کی افادیت واہمیت دوچند ہوگئی ہے۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ اس عالیشان تصنیف کے مصنف جناب مولانا رضی الاسلام ندوی جو کہ درجنوں تحقیقی کتب کے مصنف ہیں اور بہت بڑے سکالر ہیں، کی اس کاوش کو قبول فرما کر جنتوں میں ان کے لیے محل بنائے آمین اور بندہ ناچیز کے لیے بھی ثواب کا باعث بنائے۔ آمین یارب العالمین

خادم کتاب وسنت

محمد ناصر

19 اگست 2016ء لاہور

پیش لفظ

انبیاء کی تاریخ میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن میں جتنے انبیا کا تذکرہ ان کے ناموں کی صراحت کے ساتھ آیا ہے، ان میں بیش تر آپ ہی کی نسل سے تھے۔ دنیا کی بڑی مذہبی قومیں نہ صرف آپ پر ایمان اور آپ سے عقیدت کا تعلق رکھتی ہیں، بلکہ آپ سے انتساب کا شرف بھی انہیں حاصل ہے۔ نزول قرآن کے وقت جو قومیں قرآن کی براہ راست مخاطب تھیں، حضرت ابراہیمؑ ان سب کے جدامجد تھے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے آپ کا تذکرہ بار بار اور پورے زور وقوت کے ساتھ کیا ہے۔ انبیائی سلسلۃ الذہب میں حضرت ابراہیمؑ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے بعد سب سے زیادہ تذکرہ آپ ہی کا ہوا ہے۔ مطالعۂ قرآن کے دوران حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں چند باتیں بہت ابھر کر سامنے آتی ہیں:

۱۔ قرآن کریم میں ”ملت ابراہیم“ کا تذکرہ بار بار ہوا ہے۔ قرآن نے یہود ونصاریٰ کی سرزنش کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ یوں تو اپنے جدامجد کا دم بھرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ انھیں کے طریقے پر چل رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ملت ابراہیمی میں بہت زیادہ تحریفات کردی ہیں اور اس میں بہت سی باتیں اپنی خواہش کے مطابق شامل کرلی ہیں۔ قرآن ایک طرف انھیں دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے خودساختہ طریقوں کو چھوڑ کر ملت ابراہیمی کو اختیار کریں تو دوسری طرف وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ اسی دین کی دعوت دے رہے ہیں، جسے حضرت ابراہیمؑ لے کر آئے تھے۔

۲۔ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی فضیلتیں مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت

سے اعزازات واکرامات سے نوازا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں، جو اللہ کے ایک فرماں بردار بندے میں ہونی چاہییں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کو پیش نظر رکھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اس سے سرِ مو انحراف نہیں کیا۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کو شہرت ملی اور دونوں کی نسلیں خوب پھلیں اور پھولیں۔ حضرت اسماعیلؑ کی نسل بنی اسماعیل تھی اور حضرت اسحاقؑ کی نسل ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کی طرف منسوب ہوکر بنی اسرائیل کہلائی۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان منافست پیدا ہوگئی۔ اور یہ منافست اتنی بڑھی کہ بنی اسرائیل نے تمام فضیلتیں اپنی جانب منسوب کرلیں اور حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر پردہ ڈال دیا، جن سے حضرت اسماعیلؑ کی فضیلت کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ ان کی مذہبی کتابوں سے بھی اس پہلو پر کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ قرآن کریم نے جہاں کتب سابقہ کی دوسری بہت سی تحریفات کی اصلاح کی ہے، وہیں اس نے حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے، جنھیں بنی اسرائیل نے نظر انداز کردیا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی حیات طیبہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ آپ کا تذکرہ قصص الانبیاء اور قصص القرآن نامی کتابوں میں بھی ہے اور مستقل کتابیں بھی تصنیف کی گئی ہیں۔ مگر ان میں محض زمانی ترتیب سے آپ کی حیات طیبہ کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ملتِ ابراہیمی اور اسوۂ ابراہیمی کے موضوعات کم ہی زیر بحث آئے ہیں۔ اس سلسلے کی معلومات یکجا اور مربوط انداز میں نہیں ملتیں۔ زیر نظر کتاب انہیں پہلوؤں کو نمایاں کرکے پیش کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔

کتاب کے ایک باب میں ملتِ ابراہیمی پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ قرآنی بیانات کی روشنی میں اس کے عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پھر اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ یہود و نصاریٰ نے ملت ابراہیمی کے بعض عناصر کو فراموش کردیا تھا، اس موضوع سے مفصل بحث کی گئی ہے کہ اسلام میں ملت ابراہیمی کے تمام عناصر باقی رکھے گئے ہیں۔ ایک باب میں قرآن میں مختلف مقامات پر مذکور حضرت ابراہیمؑ کے اوصاف و شمائل کو یکجا کیا گیا ہے اور ان کی روشنی میں ''اسوۂ ابراہیمی'' کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک باب حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت پر بعض قدیم و

جدید اعتراضات کے تنقیدی جائزہ کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے شروع میں ایک باب ''عہد ابراہیمؑ'' پر اور دوسرا ''حضرت ابراہیمؑ کی حیات طیبہ'' پر شامل کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا بیشتر حصہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ اور بعض دوسرے مجلّات میں شائع ہو چکا ہے۔ میرے لیے باعث اطمینان امر یہ ہے کہ یہ پورا مسودہ میرے استاذ گرامی محترم مولانا سید جلال الدین عمری مدظلہ العالی صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کی نظر سے گزر چکا ہے اور ان کے قیمتی مشوروں کی روشنی میں میں نے اس میں ترمیم واضافہ بھی کیا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس کتاب میں حضرت ابراہیم کی شخصیت کا محض تاریخی مطالعہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس میں آپ کی دعوت اور پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی تالیف میں سب سے زیادہ استفادہ قرآن وحدیث سے کیا گیا ہے۔ بائبل، کتب تاریخ وسیرت اور کتب قصص الانبیاء وغیرہ سے بھی ضروری حد تک فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ان کتابوں میں حضرت ابراہیمؑ کی جانب منسوب واقعات کا کوئی استناد نہیں ہے۔

دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو ملت ابراہیمی کے اتباع اور راقم سطور کو خدمت دین کی سعادت بخشے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

محمد رضی الاسلام ندوی

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۷ رجون ۱۹۹۹ء

باب اول

عہدِ ابراہیم

حضرت ابراہیمؑ سے پہلے

اللہ تعالیٰ نے ایک طرف انسانوں کو ارادہ واختیار کی آزادی بخشی اور دوسری طرف انہی میں سے کچھ برگزیدہ لوگوں کو ان کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیا۔ ان برگزیدہ شخصیات کو ہم رسول کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر رسول تھے۔ ان سے پہلے بھی متعدد رسول دنیا میں بھٹکے ہوئے انسانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے چکے تھے۔

الف۔ قوم نوح

قرآن کریم میں جن اولوالعزم رسولوں کا تذکرہ ہے ان میں سب سے پہلے مبعوث ہونے والے حضرت نوحؑ ہیں۔ ان کی قوم دجلہ وفرات کے دوآبہ میں آباد تھی۔ وہ شرک میں مبتلا ہوگئی تھی۔ مٹی پتھر کے بت تراش کر ان کی پوجا کرنے لگی تھی۔ اس شرک نے ان کے معاشرے میں فساد برپا کردیا تھا۔ ایک طبقہ نے خود کو دیوتاؤں کا دنیوی مظہر قرار دے کر سیاسی اقتدار پر قبضہ جمالیا تھا اور عوام کو اپنے ظلم وجور کا شکار بنا رکھا تھا۔ حضرت نوحؑ نے توحید کی دعوت دی، اللہ کی عبادت واطاعت کا حکم دیا اور نافرمانی کی صورت میں اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۙ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَ اَطِيْعُوْنِ ۙ

(نوح:۲،۳)

اس نے کہا: ”اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (پیغمبر) ہوں (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو“۔

حضرت نوحؑ کی دعوت کا ان کی قوم پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ گنتی کے چند افراد کے علاوہ پوری قوم نے انہیں جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا۔ حضرت نوحؑ طویل عرصے تک ان کے درمیان فریضۂ دعوت انجام دیتے رہے۔ مختلف طریقوں سے انھیں سمجھایا۔ مگر وہ گمراہی میں پڑے رہے۔ بالآخر جب ان پر حجت تمام ہوگئی تو اللہ کا عذاب آیا اور سب ایک زبردست سیلاب میں غرقاب ہوگئے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّ ازْدُجِرَ ۝ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ (القمر: ۹-۱۲)

ان سے پہلے نوح کی قوم جھٹلا چکی ہے۔ انھوں نے ہمارے بندے کو جھوٹا قرار دیا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے۔ اور وہ بری طرح جھڑکا گیا۔ آخر کار اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "میں مغلوب ہو چکا۔ اب تو ان سے انتقام لے"۔ تب ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا اور یہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا۔

ب۔ قوم عاد

قوم نوح کے بعد قوم عاد کو عروج حاصل ہوا ــ یہ حضرت نوحؑ کے پوتے ارم کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان واقع ہے۔ یہ جسمانی حیثیت سے بڑے تنومند تھے۔ تمدن و معاشرت کے اعتبار سے بہت بلند تھے۔ اونچی اور پرشکوہ عمارتیں بنانے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ لیکن انھیں اپنی طاقت وقوت پر بڑا گھمنڈ بھی تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک میں بھی مبتلا تھے۔

ان کی اصلاح وہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ہودؑ کو مبعوث کیا۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کی یاد دلاتے ہوئے انہیں صرف اللہ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی اور نافرمانی کی صورت میں اس کے عذاب سے ڈرایا۔ فرمایا:

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۙ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۚ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۚ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۚ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۙ وَّجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۚ (الشعرآء: ۱۲۸-۱۳۴)

اب تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لا حاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمھیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبار بن کر ڈالتے ہو۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمھیں جانور دیے، اولادیں دیں، باغ اور چشمے دیے۔

لیکن ان لوگوں نے حضرت ہودؑ کی دعوت وتبلیغ کا کوئی اثر نہیں لیا۔ بلکہ ان کا مذاق اڑایا اور انہیں جھٹلایا۔ انہیں اپنے جیسا انسان قرار دیا۔ اور اپنے کفر وسرکشی پر مصر رہے۔ صرف چند لوگوں کو ان پر ایمان لانے کی توفیق نصیب ہوئی۔ بالآخر جب اللہ کا عذاب آیا تو ان کی بلند وبالا عمارتیں انھیں نہ بچا سکیں اور وہ کھجور کے بوسیدہ تنوں کی طرح ڈھیر ہو گئے:

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝

(الحاقہ: ۶-۸)

اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلّط رکھا (تم وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں، جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ اب کیا ان میں سے کوئی تمہیں باقی بچا نظر آتا ہے؟

ج۔ قوم ثمود

قوم عاد کے بعد اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود کو اس کا جانشیں بنایا۔ اس کا مسکن شمالی مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا، جو آج بھی الحجر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بہت ترقی یافتہ لوگ تھے۔

پہاڑوں کو تراش کر عالی شان عمارتیں بناتے تھے۔ لیکن دوسری طرف ان میں شرک اور بت پرستی کا بہت زور تھا۔ قوم کا سربرآوردہ طبقہ غریب اور کمزور طبقے پر بہت ظلم ڈھاتا تھا۔ ان لوگوں کی طرف حضرت صالحؑ کی بعثت ہوئی۔ حضرت صالحؑ نے انہیں اللہ کے احسانات یاد دلائے اور انہیں شرک و بت پرستی اور فتنہ و فساد سے روکا۔ فرمایا:

وَاذْكُرُوٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا وَّتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ فَاذْكُرُوٓا آلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝

(الاعراف: ۷۴)

یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

حضرت صالحؑ کی دعوت پر صرف نچلے طبقے کے چند لوگوں نے لبیک کہا۔ رہے اونچے طبقے کے لوگ تو وہ جاہ و حشمت اور مادی ترقی کے نشے میں چور تھے۔ وہ حضرت صالحؑ پر ایمان نہیں لائے اور اپنی گمراہیوں میں غرق رہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ حضرت صالحؑ کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ کمزور طبقے کے جن لوگوں نے اسے قبول کیا ان سے جھگڑنے اور انہیں ستانے لگے۔ انھوں نے حضرت صالحؑ سے نبوت کی کوئی نشانی مانگی۔ بالآخر معجزے کے طور پر ایک اونٹنی کا ظہور ہوا۔ اور حضرت صالحؑ نے اعلان کر دیا کہ ایک دن یہ اونٹنی تنہا پانی پیے گی اور دوسرے دن دوسرے جانور پئیں گے۔ یہ شر پسند کچھ دن تو اس اونٹنی کو برداشت کیے رہے مگر پھر باہم سازش کر کے اسے قتل کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ حضرت صالحؑ اور ان کے گھر والوں پر بھی شب خون مارنے کا منصوبہ بنایا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے، عذاب الٰہی نے انھیں آ گھیرا اور وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ۝

(القمر: ۳۱)

ہم نے ان پر بس ایک ہی دھما کا چھوڑا اور وہ باڑے والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح بھس ہو کر رہ گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کا عہد

حضرت صالحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ آتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ کا عہد متعین کرنے کی دو طرح سے کوشش کی گئی۔ ایک مابعد طوفان نوح اور دوسرے ماقبل ولادت مسیح۔ جہاں تک پہلے طریقے کا تعلق ہے، اس سلسلے میں تورات کے نسخوں میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ طوفان نوح سے ولادت ابراہیمؑ تک کا زمانہ عبرانی نسخے کے مطابق ۲۹۲ (دوسو بانوے) سال، یونانی نسخے کے مطابق ۱۰۷۲ سال اور سامری نسخے کے مطابق ۹۴۲ سال ہے۔ ان تینوں کے درمیان تطبیق ناممکن ہے۔ اگر عبرانی نسخے کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کی ولادت طوفان نوح کے ۲۹۲ سال بعد ہوئی تھی اور حضرت نوحؑ طوفان کے بعد ۳۵۰ سال زندہ رہے، جیسا کہ کتاب پیدائش باب ۹ آیت ۲۲ میں مذکور ہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی وفات کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۵۸ سال ہو اور یہ تمام مورخین کے نزدیک غلط ہے، اور یونانی اور سامری نسخوں سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ولادت یونانی نسخے کے مطابق حضرت نوحؑ کی وفات کے ۷۲۲ سال بعد اور سامری نسخے کے مطابق ۵۹۲ سال بعد ہوئی تھی۔ اسی طرح یونانی نسخے میں حضرت ابراہیمؑ کے نسب نامے میں ارفکسد اور سلح کے درمیان ایک اور بطن قینان کا اضافہ ہے۔

اس اختلاف کی وجہ سے مؤرخین نے اس معاملے میں ان تینوں نسخوں پر اعتماد نہیں کیا ہے۔ انھوں نے یہ زمانہ ۳۵۲ سال متعین کیا ہے۔ مشہور یہودی مورخ یوسیفوس کا خیال ہے کہ یہ زمانہ ۹۹۳ سال کا ہے۔ قدیم مورخین میں سے بعض نے یونانی نسخے کو صحیح قرار دیا ہے اور بعض نے سامری نسخے کو ترجیح دی ہے۔ (۱)

تورات کے نسخوں کے علاوہ دوسری تاریخی روایات بھی ملتی ہیں۔ لیکن ان میں بھی زبردست اختلافات ہیں۔ بعض مورخین نے حضرت ابراہیمؑ کو ''حمورابی'' کا معاصر قرار دیا ہے۔ البرائٹ نے اپنی کتاب ''مغربی ایشیا کی ابتدائی تاریخ پر تیسری نظر'' میں لکھا ہے:

---

(۱) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اظہار الحق، علامہ رحمۃ اللہ کیرانوی، ۱/ ۳۴۰-۳۴۴

حموار بی کا زمانہ ۱۷۲۸ (ایک ہزار سات سو اٹھائیس) ق م اور ۱۶۸۶ ق م کے درمیان ہے۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ سترہویں اور سولہویں صدی ق م کے درمیان قرار پاتا ہے"

جب کہ راجرس نے حمورابی کے عہد کی تعین ۲۴۴۲ ق م اور ۲۲۸۸ ق م کے مابین کی ہے۔ اس کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کا عہد چوبیسویں اور تیئسویں صدی ق م کے مابین متعین ہوتا ہے۔[1]

سر لیونارڈ وولی جس نے ۱۹۲۹ء میں بابل کے آثار قدیمہ کی کھدائی کرنے والی ٹیم کی سربراہی کی تھی، اس نے حضرت ابراہیمؑ کی ولادت کا زمانہ ۲۱۶۰ ق م متعین کیا ہے۔ بہت سے محققین نے اس کو قبول کیا ہے۔

قوم ابراہیمؑ

حضرت ابراہیمؑ کا ظہور سرزمین بابل (موجودہ عراق) کے ایک شہر میں ہوا۔ اس شہر کا کیا نام تھا۔ اس سلسلے میں قدیم مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔[2] بائبل میں اس کا نام "اور" مذکور ہے۔[3] یہیں وہ جوانی کی عمر کو پہنچے اور یہیں ان کی بعثت ہوئی۔ یہاں سے ہجرت کر کے وہ حران ہوتے ہوئے شام پہنچے اور وہیں سکونت اختیار کی ایک موقع پر آپ مصر تشریف لے گئے۔ آپ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو بے آب و گیاہ وادی مکہ میں آباد کرنے کے لیے ان کے ساتھ سفر کیا اور اللہ کے حکم سے وہیں توحید کا مرکز قائم کیا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں کی سیاسی، تمدنی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی صورت حال پر کچھ روشنی ڈال دی جائے تاکہ اس کے تناظر میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور پیغام کی اہمیت واضح ہو سکے۔

(الف) سیاسی حالات

قدیم تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ہزار سال پہلے ان علاقوں پر سامی قومیں حکمران تھیں۔ سامیوں کا اصل وطن جزیرۃ العرب تھا۔ مختلف اسباب سے انھوں نے دوسرے علاقوں کی

---

(۱) انبیائے قرآن ص ۱۶۶-۱۶۷

(۲) قصص الانبیاء۔ ثعلبی ص ۶۷، الکامل فی التاریخ۔ ابن الاثیر ۱/۵۳

(۳) کتاب پیدائش، باب ۱۱ صفحہ ۳۱

طرف ہجرت کی۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے:

> ''ارم بن سام کی نسل سے عمالیق ہیں۔ یہ لوگ مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ مصر کے فراعنہ اور بابل کے جبابرہ انہیں میں سے تھے'' (۱)

بابل کی جانب عربوں کی ہجرت دو طرح سے تھی۔ ایک سست رفتاری کے ساتھ اور دوسری کافی سرعت کے ساتھ اور بڑی تعداد میں۔ پہلی قسم کی ہجرتیں تو ہر زمانے میں ہوتی رہیں۔ لیکن دوسری قسم کی ہجرتیں بعض بڑے حادثات کے نتیجے میں ہوئیں۔ ان کی پہلی ہجرت کا تذکرہ قدیم تاریخ میں یوں ملتا ہے کہ سامیوں کا ایک قبیلہ جس کا نام کلدہ تھا، اس نے آکر دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقہ میں پڑاو ڈالا۔ اس کی ہجرت کا زمانہ تو معلوم نہیں ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ ۳۶۰۰ ق م میں اس علاقہ میں ان کے تمدن کو عروج حاصل تھا۔ عراق کی جانب سامیوں کی ہجرت کی دوسری لہر ۲۵۰۰ ق م کے آس پاس میں آئی۔ (۲)

سامی اقوام زمانہ قدیم میں بابل ہوتے ہوئے شام تک پہنچ گئی تھیں۔ شام کے علاقوں میں ان کی موجودگی کا قدیم ترین ثبوت ''اشوری تحریریں'' ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں وہ ان تحریروں کے زمانے سے بہت پہلے پہنچ گئے تھے۔ اس لیے کہ یہ علاقے جزیرۃ العرب کا تسلسل تھے اور وہاں کے باشندے ان علاقوں میں بلا روک ٹوک پوری آزادی سے آ جا سکتے تھے۔ ڈاکٹر کرد علی نے لکھا ہے:

> ''شام میں عرب طویل عرصے سے رہائش پزیر تھے۔ صحیح قول کے مطابق ان کی موجودگی وہاں تقریباً ۲۵۰۰ ق م سے ہے۔ بعض لوگوں نے یہ زمانہ تقریباً ۴۰۰۰ ق م بتایا ہے۔ دوسری قدیم قومیں بھی انہیں کی تہذیب میں ڈھل گئی تھیں'' (۳)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام میں تقریباً ۵۰۰۰ ق م سے فینیقی آباد تھے۔ یہ لوگ بھی عرب تھے۔ ان کا اصل وطن خلیج فارس میں بحرین کا علاقہ تھا۔ شام میں ان کی مملکت کو کافی شہرت حاصل تھی۔ (۴)

---

(۱) المعارف۔ ابن قتیبہ ص ۱۳

(۲) اتجاہ الموجات البشریۃ فی جزیرۃ العرب، ص ۷-۹، العرب قبل الاسلام۔ جرجی زیدان، ۱/۴۰

(۳) خطط الشام، ۱/۲۰

(۴) خطط الشام، ۱/۱۸

رہا مصر تو وہاں بھی سامی اقوام زمانۂ قدیم میں پہنچ گئی تھیں۔ ماضی قریب میں ہونے والی اثری تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ مصر میں لوہے کا زمانہ (Iron Age) سامیوں کے وہاں پہنچنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ گویا اس سے قبل مصری لوہے کے ہتھیاروں سے واقف نہ تھے۔ زمانۂ قدیم ہی سے سامیوں کے مصر پہنچ جانے کی ایک دلیل یہ ہے کہ مصریوں کا ایک قدیم ترین معبود ''فتاح'' سامی الاصل ہے۔(۱)

۲۰۰۰ ق م کے اوائل میں شام کے سامیوں نے مصر پر حملہ کیا اور اس کے سمندری علاقہ پر قابض ہو گئے۔ ان کا قبضہ اٹھارہویں صدی ق م تک قائم رہا۔ مصری انھیں ''شاسو''، یونانی ''ہیکسوس'' اور عرب عمالقہ یا عرب بائدہ کے نام سے پکارتے تھے۔

(ب) تہذیب وتمدن

گزشتہ تفصیل سے واضح ہوا کہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں بابل، شام اور مصر میں سامی اقوام حکومت کر رہی تھیں۔ یہ قومیں علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے میدان میں بہت ترقی یافتہ تھیں۔

بابل ایک بڑا تجارتی مرکز تھا۔ وہاں دور دراز مقامات سے تجارتی سامان آتا اور اسی طرح دور دراز ملکوں میں بھیجا جاتا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ ''ار'' کے تاجروں کی ایک جماعت ۲۰۰۰ ق م کے قریب بحرین سے تجارت کرتی تھی۔ اس مقصد سے اس نے ایک بحری بیڑا تیار کر رکھا تھا۔ بحرین کے جزیرہ تلمون کو بھی ایک اہم تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں عمان سے قیمتی حجریات اور ہندوستان سے سونا، لکڑیاں، خوشبوجات اور دوسرے قیمتی سامان آتے تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲۰۰ اور ۲۱۰۰ ق م کے درمیانی عرصے میں ''ار'' کے باشندوں کی کشتیاں اس سامان کو عراق لانے کی لیے مستقل حرکت میں رہتی تھیں اور وہاں سے شام اور شام سے بحر متوسط تک پہنچاتی تھیں۔(۲)

اہل بابل علم نجوم میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ستارے معبودوں کے ارادے کی خبر دیتے ہیں۔ ان کے ذریعے خوش بختی اور نحوست کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ وہ ان ستاروں کی حرکات کے ذریعے سے آندھی، بارش، طوفان، سیلاب، پیداوار اور بادشاہوں کی فتح و

(۱) العرب قبل الاسلام ۱/۵۲

(۲) المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی، ۱/ ۵۴۵-۵۴۶

شکست کا پتا لگاتے تھے۔ کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اس کے ستارے کو دیکھتے تھے اور برجوں کی ہیئت اور فلک میں اس کی پوزیشن کے حساب سے اس کے مستقبل کی پیش گوئی کرتے تھے۔ کلدانی کواکب کی حرکات کے حساب سے چاند گرہن کا بھی پہلے سے پتا لگا لیتے تھے۔ کلدہ اور اشور کے آثار قدیمہ سے برآمد ہونے والی الواح جو ۳۰۰۰ ق م سے تعلق رکھتی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے باشندے اس قدیم عہد میں لکھنا جانتے تھے۔(۱)

فن تعمیر میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ انھوں نے بڑے بڑے محل تعمیر کر رکھے تھے۔ ان کے بت خانے کئی کئی منزلہ اور مربع برجوں والے ہوتے تھے۔ وہ پیتل اور سونے چاندی کے خوب صورت مجسمے ڈھالتے اور پتھروں اور لکڑیوں پر تصویریں بناتے تھے۔ دریائے فرات پر بندھ باندھ کر انھوں نے خود کو اس کی طغیانی سے محفوظ کر لیا تھا۔(۲)

اہل شام بھی زمانۂ قدیم میں ایک بڑی تجارتی قوم تھے اور پڑوسی ملکوں سے ان کے تجارتی تعلقات تھے۔ انھوں نے بڑی بڑی کشتیاں تیار کر رکھی تھیں۔ اور ان کے ذریعے سے ان کی بحری تجارت خوب زوروں پر تھی۔ بحری اسفار کے دوران قطب تارے کے ذریعے رہنمائی حاصل کرتے تھے اور بے خوف و خطر سمندروں میں دور تک چلے جاتے تھے۔(۳) انہیں موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی اور نقش و نگار کے فن سے بھی دلچسپی تھی۔ لیکن ان میں انہیں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں تھی، بلکہ یہ فنون انھوں نے بابلی، اشوری اور مصری اقوام سے حاصل کیے تھے۔

قدیم زمانے میں اہل مصر بھی اعلیٰ و ارفع تہذیب و تمدن کے مالک تھے۔ اس تمدن کو انھوں نے دوسری قوموں کی مدد سے نہیں اخذ کیا تھا بلکہ خود اپنی ذاتی کوششوں سے پروان چڑھایا تھا۔

اس تہذیب و تمدن کو ہیکسوس کے مصر پر قبضہ کرنے کے بعد بھی زوال نہیں آیا۔ اس لیے کہ انھوں نے فراعنہ کے نقش قدم کی پوری پیروی کی۔ ان کے عادات و اطوار، مذہب اور انتظام ریاست ہر چیز کو اپنا لیا، ان کے رنگ میں رنگ گئے اور اس ملک کے بادشاہوں اور فراعنہ کے مثل بن گئے۔(۴)

---

(۱) تاریخ ملل قدیمہ۔ ص ۹۴-۹۵، ۱۷۳

(۲) حوالہ سابق ص ۱۶۸-۱۶۹، التاریخ القدیم ص ۹۸

(۳) خطط الشام۔ کرد علی، ۵/۳۲-۳۳

(۴) العرب و اطوارھم، ۱/۲۱-۲۲

اہل مصر علم نجوم میں مہارت رکھتے تھے۔ زمین مسطح، ہوا خوش گوار اور مطلع صاف ہونے کی وجہ سے انھیں ستاروں کی حرکات میں غور کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے طویل تحقیقات کے بعد سورج کی گردش کے حساب سے سال کا اندازہ لگالیا تھا۔[1] مصر کی سب سے اہم چیز جس نے اسے شہرت دوام عطا کی، وہ اس کے مقابر وہیاکل ہیں، جنھیں اہرام کہا جاتا ہے۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ روح ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اہرام کی شکل میں ایسے مقبرے بنائے، جو عرصۂ دراز تک قائم رہ سکیں۔ یہ اہرام فن تعمیر میں اہل مصر کی مہارت کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں بڑی بڑی چٹانیں کاٹنے، تراشنے اور مطلوبہ شکل میں ڈھالنے کا فن آتا تھا۔ اسی طرح وہ مجسمہ سازی اور مصوری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔[2] اہرام کے علاوہ مصر کے شاہی محل بھی مصریوں کے فن تعمیر کا خوب صورت نمونہ ہیں۔ انھوں نے پہاڑوں اور چٹانوں کو تراش کر زیر زمین مقبرے بھی بنا رکھے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جسم سے روح نکلنے کے کچھ عرصے بعد دوبارہ لوٹ کر آتی ہے۔ اس لیے انھوں نے جسم کو محفوظ کرنے کے لیے تحنیط (ممی بنانے) کا فن ایجاد کیا تھا۔ لاشیں حنوط لگانے کے بعد طویل عرصے تک محفوظ رہتی تھیں۔[3]

(ج) مذہبی صورت حال

اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو جس عیش و عشرت، خوش حالی، فارغ البالی اور تہذیب و تمدن کی ترقی سے نوازا تھا، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ان نعمتوں پر اس کا شکر بجالاتیں، صرف اسی کی عبادت و بندگی کرتیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتیں۔ لیکن ان قوموں کے حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدترین قسم کے شرک میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں گھڑے ہوئے معبودوں کی پرستش کرتی تھیں۔ انھوں نے ان سابقہ اقوام کے انجام سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی پاداش میں ہلاک کر دی گئیں تھیں۔

اگر مذہب صابئیت کواکب اور نجوم پرستی سے عبارت ہے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں یہ قومیں صابئیت اختیار کیے ہوئے تھیں۔ صائبیت سے ہماری مراد وہ اعتقادات نہیں

---

(۱) مصر کی قدیم تاریخ، رولن (اردو ترجمہ) ص ۵۹

(۲) سواء السبیل فی سکان وادی النیل، ص ۱۲۶-۱۲۷

(۳) حوالہ بالا، ص ۱۰۴-۱۰۵

ہیں جو بعد میں فلسفہ کے زیرِ اثر اس مذہب میں شامل ہوئے اور نہ وہ تبدیلیاں ہیں جن کی بنا پر قدیم صابئیت اور جدید صابئیت میں بہت زیادہ فرق ہو گیا۔ بلکہ اگر ہم صابئیت کو تاریخی طور پر متعدد ادوار میں تقسیم کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس زمانے میں اپنے ابتدائی یا متوسط دور میں تھی۔ (۱)

شہرستانی نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں صابئہ کے دو فرقے تھے۔ ایک اصحاب الھیاکل کہلاتا تھا اور دوسرا اصحاب الاشخاص۔ صابئہ کہتے تھے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے اوامر و نواہی کی معرفت کے لیے ایک واسطہ کی ضرورت ہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ واسطہ روحانی ہو۔ اس لیے کہ روحانی واسطہ ہی پاکیزہ ہوتا ہے اور اسے رب الارباب سے تقرب حاصل رہتا ہے۔ پھر جب صابئہ خالص روحانیات پر اکتفا نہیں کر سکے تو ان میں سے ایک گروہ نے سات سیاروں اور بعض ثوابت (تارون) کو ان کے ہیاکل مان لیے اور دوسرے گروہ نے بتوں کو ان کا مظہر قرار دیا۔ اس طرح پہلا گروہ کواکب پرستی میں اور دوسرا بت پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ (۲)

اشوریوں اور کلدانیوں کے عقائد میں توحید کے اشارے بھی ملتے ہیں لیکن بہت جلد ان میں شرک، بت پرستی اور کواکب پرستی داخل ہو گئی۔ اس کا سبب خالص جغرافیائی تھا کہ ان کے یہاں بالعموم مطلع بالکل صاف اور بے ابر رہتا تھا اور رات میں ستارے خوب چمکتے تھے۔ اس بنا پر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے پھر انہیں معلوم ہوا کہ بعض ستارے اپنی جگہ قائم اور بعض اپنی جگہ سے ہٹتے رہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ثوابت اور سیاروں میں فرق کیا۔ اور سیاروں کو اپنے معبودوں کی خاص تجلی کا مقام اور ان کا ترجمان قرار دیا۔ انھوں نے ہر سیارے کو ایک معبود کا نمائندہ قرار دیا اور اسے اسی معبود کے نام سے موسوم کیا۔ پھر انہیں معلوم ہوا کہ سورج ہر روز ایک مقام سے نہیں نکلتا بلکہ اپنی جگہ سے ہٹتا رہتا ہے اور آسمان میں اس کا گردش جاری رہتا ہے اس بنا پر انھوں نے بارہ برج قرار دیے اور انہیں ارواح اور معبودوں کا مسکن قرار دیا۔ (۳)

کلدہ اور اشور کے تمام شہروں میں ابتدا میں مخصوص معبودوں کی پرستش کی جاتی تھی۔ ہر

---

(۱) استاذ عبدالرزاق حسنی نے تاریخی طور پر صابئہ کے چار ادوار قرار دیے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تین ہزار ق م کے اواسط میں صابئیت ان ممالک میں تیسرے دور سے گزر رہی تھی۔ ملاحظہ کیجئے ان کی کتاب الصابئة قدیماً وحدیثاً۔ المطبعة الرحمانية مصر

(۲) الملل والنحل للشهرستاني، بحاشيه الملل والأهواء والنحل لابن حزم، ص ۲/۷۲

(۳) تاریخ الملل القديمة، ص ۱۵۷

شہر کا ایک خاص معبود تھا، جسے اس شہر کا مالک، محافظ اور رب تصور کیا جاتا تھا اور اس شہر کے باشندے دوسرے معبودوں کے مقابلے میں اس کا زیادہ احترام کرتے تھے، لیکن بعد میں تمام شہروں میں تمام معبودوں کی پرستش ہونے لگی۔ کچھ خاص معبودوں اور ان کے شہروں کے نام درج ذیل ہیں:

شہر	دیوتا	کیفیت
۱۔ بابل	مردوک	مشتری (روشنی کا دیوتا) نیزہ، کمان اور ڈھال سے لیس ایک نوجوان جنگ جو کی صورت میں تھا۔
۲۔ اشور	اشور	جنگ کا دیوتا، بادشاہ یا فوجی کی صورت میں تھا۔
۳۔ ار (حران)	سین (ننار)	چاند دیوتا
۴۔ سپیارہ (لارسہ)	شمش (شماش)	سورج دیوتا، تخت پر بیٹھے ایک آدمی کی صورت میں تھا جس کے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چھڑی تھی۔
۵۔ کوتا (کوثی)	نرکال (نرغل)	مریخ دیوتا، جنگ اور قہر کا دیوتا، جس کا سر انسان جیسا اور بدن کا بقیہ حصہ شیر جیسا تھا۔
۶۔ بابل و نینوی	ایستار (عشتار)	زہرہ دیوی، اس کے متعدد پہلو تھے: جنگ کی دیوی: آلات جنگ سے لیس فوجی کے لباس میں۔ عشق اور حسن کی دیوی: فاختہ کی شکل میں محبت کی دیوی: ایسی عورت کی صورت میں جس کی گود میں اسکا بچہ ہے۔

ان معبودوں کے علاوہ وہ بہت سے چھوٹے اور کم طاقت وقوت والے معبودوں کی پرستش کرتے تھے۔ بیش تر معبود سیاروں، ستاروں اور اجرام سماوی سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ کا تعلق زمین سے تھا۔ بابل کی کھدائی میں نکلنے والے کتبات میں تقریباً پانچ ہزار بتوں کے نام ملتے ہیں۔ [۱]

(۱) تاریخ الملل القدیمۃ، ص ۱۵۴-۱۵۵، ارض القرآن۔ سید سلیمان ندوی، ۲/۱۵۴، ۱۵۵

بڑے بڑے دیوتاؤں کے عالی شان معبد قائم تھے ان کے لیے بڑی بڑی جائیدادیں وقف تھیں اور کثرت سے نذرانے بھی آتے تھے۔ ان معبدوں کے پجاری ان جائیدادوں کی آمدنی اور نذرانوں سے فیض اٹھاتے تھے۔ ان میں بہ کثرت عورتیں دیوتاؤں کے نام پر وقف تھیں۔ یہ معبد قحبہ گری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔

اہل شام بھی ابتدا میں موحّد تھے۔ وہ اپنے معبود کو ''بعل'' کہتے تھے جس کے معنی رب اور آقا کے ہیں۔ پھر وہ اپنے رب کو من چاہی صورتوں میں پیش کرنے لگے۔ ہر شہر کا ایک مخصوص رب قرار پایا۔ افلاک، نجوم اور دوسری قوتوں کو خدا بنا لیا گیا۔ انھوں نے اپنے معبودوں کی بیویاں اور دیویوں کے شوہر بنا لیے تھے۔ رب الارباب کا مجسمہ انھوں نے ایسا تیار کیا تھا کہ اس کا اوپر کا نصف دھڑ انسان کا اور نچلا دھڑ مچھلی کا تھا۔ آرامی سورج، چاند، ساتوں سیاروں، ہوا، آگ وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔ کاہن سال کے مخصوص دنوں میں مذہبی تیوہار منعقد کرتے تھے۔ ان میں رقص و سرور کی محفلیں جمتی تھیں۔ لڑکیوں اور قیدیوں کو ہیکلوں کے آستانوں پر بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ ہیکل بدکاری اور قحبہ گری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ (۱)

مصریوں نے پہلے مظاہر فطرت اور اجرام سماوی (سورج، چاند، ستاروں) کی پرستش کی۔ اس کے بعد بت پرستی کی طرف مائل ہوئے۔ رولن نے لکھا ہے:

> ''مذہب کے معاملے میں مصری بہت بے وقوف اور احمق واقع ہوئے تھے۔ ان کے یہاں بتوں کی کثرت تھی۔ اور ان کے درمیان طبقات اور مراتب تھے۔ ان میں سب سے بڑے اوسرس یا ازیریس یعنی سورج دیوتا اور اسس یا ایزیس یعنی چاند دیوتا تھے۔ ان کی پرستش تمام علاقوں میں عام تھی۔ اس میں شک نہیں کہ بت پرستی کا ظہور انہی سیاروں کی پرستش کے نتیجے میں ہوا۔'' (۲)

اس کے بعد وہ ہر اس چیز کی پرستش کرنے لگے، جس سے انہیں کسی بھی قدر منفعت یا ضرر کی امید ہوتی تھی۔ ان کے معبدوں میں دریائے نیل، آگ، بیل، بھیڑ، کتا، گھڑیال، نیولا، بلی اور دوسرے حیوانات، پرندے حتی کہ سبزیوں تک کے نام ملتے ہیں۔ رومی شاعر بوفنال ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے:

---

(۱) خطط الشام، ۶/ ۲۰۵-۲۰۶

(۲) تاریخ مصر القدیم، ص ۴۵

''اس قوم کے سادہ لوحی پہ قربان جایئے جس کے معبود کھیتوں میں اگتے ہوں''(۱)

ان کے معبودوں کی اتنی کثرت ہوگئی کہ ہر شہر اور ہر بستی کا ایک یا ایک سے زائد معبود ہوگئے تھے۔ چھوٹے معبودوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ ہر انسان کا ایک الگ خدا تھا۔ بلکہ معبودوں کی تعداد عابدوں سے بڑھ گئی تھی۔

بڑے بڑے معبودوں کے لیے انھوں نے ہیکل قائم کر رکھے تھے۔ان میں قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ان ہیکلوں میں مذہبی مراسم ادا کرنے کے لیے دیوداسیوں کی خدمات حاصل تھیں۔(۲)

(د) معاشرت واخلاق

شرک کے نتیجے میں ان میں متعدد اخلاقی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں۔آوارگی، بے حیائی اور معاشرتی انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔انسان مختلف طبقات میں بٹ گئے تھے اور حکمران طبقہ کمزور طبقے پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہا تھا۔

اشور و بابل کے حکمرانوں کو لامحدود اختیارات حاصل تھے۔ان کی مرضی کو قانون کا درجہ حاصل تھا۔وہ جو کچھ چاہتے تھے کرتے تھے،ان کے کسی کام پر کوئی ان کا مواخذہ نہیں کرسکتا تھا۔وہ اہم مسائل میں سربرآوردہ طبقے سے مشورہ تو لیتے تھے،لیکن وہ ان کی کسی رائے کی مخالفت نہیں کرسکتے تھے۔ان میں فوجی سربراہ کو سب سے زیادہ عظمت کا مقام حاصل تھا۔(۳) ان کی آبادی تین طبقوں میں مشتمل تھی:

(۱) عمیلو: یہ اونچے طبقے کے لوگ تھے،جن میں پجاری،حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔

(۲) مشکینو: یہ تجار، اہل صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔

(۳) اردو: یعنی غلام۔

ان میں سے پہلے طبقے یعنی عمیلو کو خاص اختیارات حاصل تھے۔ان کے فوجداری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے اور ان کی جان و مال کی قیمت دوسروں سے بڑھ کر تھی۔زندگی

---

(۱) التاریخ القدیم ص ٦٦

(۲) الحضارۃ المصریۃ، غوستاف لوبون،ص ٦٥

(۳) التاریخ القدیم ص ٩٣

میں ان لوگوں کا نقطۂ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دولت کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصد حیات تھا۔ سود خواری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے خداؤں سے ان کی دعائیں زیادہ تر درازی عمر، خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ (۱)

مصر میں فراعنہ کو تقدیس کا مقام حاصل تھا۔ انہیں روئے زمین پر "رع" یعنی سورج دیوتا کے خاندان کا فرد سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے بعض فراعنہ کا لقب "رعمیس" (سورج دیوتا کا بیٹا) مشہور ہے۔ اسی وجہ سے انہیں بشریت سے بلند تر مقام حاصل تھا۔ بادشاہ کو زمین کا خدا، رب اور حاکم مطلق سمجھا جاتا تھا۔ اسے قانون سے بالاتر قرار دیا جاتا تھا۔ (۲) باقی لوگ تین طبقات میں بٹے ہوئے تھے۔

۱۔ کاہن: انہیں معاشرے میں بلند مقام حاصل تھا۔ اور یہ خصوصی اختیارات سے بہرہ ور تھے۔

۲۔ فوج:

۳۔ عوام: ان کی پانچ ذیلی قسمیں پیشوں کے اعتبار سے تھیں: کاریگر، کسان چرواہے، بڑھئی اور ملاح۔ (۳)

یہ طبقات پیشے کی بنیاد پر بنائے گئے تھے۔ کسی شخص کو خاندانی اور موروثی پیشے کے علاوہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہ تھی۔

ان طبقات میں کاہنوں کو سب سے زیادہ قدر و منزلت حاصل تھی۔ انہیں دوسرے طبقات کے افراد کے مقابلے میں بہت سے حقوق اور اختیارات حاصل تھے۔ فراعنہ ان پر اعتماد کرتے اور امور مملکت میں انہیں شریک رکھتے تھے اور عوام ان کی غایت درجہ تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اسی طرح انہیں مصری معاشرے میں اتنی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ کوئی اہم کام ان کے تعاون کے بغیر انجام دینا ممکن نہ تھا۔ (۴)

---

(۱) سر لیونارڈ وولی، بحوالہ تفہیم القرآن، ۱/۵۵۴، سورۂ انعام حاشیہ ۵۲

(۲) سواء السبیل ص ۱۲۱-۱۲۲

(۳) الحضارة المصریة ص ۶۶

(۴) تاریخ مصر القدیم ص ۴۳، سواء السبیل ص ۹۷

بابِ دوم

حیاتِ ابراہیم علیہ السلام

نام ونسب

حضرت ابراہیمؑ کا نام کتب سماوی میں مذکور ہے۔ بائبل میں ہے کہ پہلے آپ کا نام 'ابرام' تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ عہد باندھا اور آپ کی ذرّیت کی کثرت کا وعدہ فرمایا تو آپ کا نام 'ابرہام' قرار پایا۔ قرآن کریم میں آپ کا نام 'ابراہیم' ۶۹ مقامات پر آیا ہے۔

ابراہیمؑ یا ابرہام عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ یہ دو کلموں سے مرکب ہے۔ 'اب' بمعنی باپ اور 'راہام' بمعنی جماعت یا بڑی تعداد۔ یعنی بہت بڑی ذریت والا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ سریانی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں 'اب راحم' یعنی رحم دل باپ۔

بائبل میں آپ کا نسب اس طرح بیان ہوا ہے:

ابرام (ابرہام) بن تارح بن نحور بن سروج بن رعو بن فلج بن عبر بن سلح بن عبر بن سلح بن ارفکسد بن سم بن نوح بن لمک بن متوسلح بن حنوک بن یارد بن محلل ایل بن قینان بن انوس بن سیت بن آدم

آزر باپ یا چچا؟

حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا کیا نام تھا؟ اس سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بائبل میں اس کا نام 'تارح' بیان کیا گیا ہے (پیدائش باب ۱۱: ۲۶) جب کہ قرآن میں آزر مذکور ہے۔ (الانعام: ۷۴) اہل تفسیر اور سوانح نگاروں نے اس اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک قول یہ ہے اس کا حقیقی نام 'تارح' تھا۔ آزر دراصل ایک بت کا نام تھا جس کی وہ

پرستش کرتا تھا۔ چنانچہ اس کا نام بھی آزر پڑ گیا۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ آزر وصف ہے۔ اس کے معنی معین و مددگار کے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا باپ شاہِ وقت کا دست راست تھا۔ اس لیے اسے آزر کہا جانے لگا۔

ایک رائے یہ ہے کہ تارح اور آزر دونوں نام ہیں یا ایک نام ہے اور دوسرا لقب۔ ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ دونوں حقیقت میں ایک ہی لفظ ہیں۔ لسانی تغیرات کا شکار ہو کر تارح آزر ہو گیا۔ زمانہ نزول میں چونکہ اس کا نام آزر ہی معروف تھا اس لیے قرآن نے اسی کو اختیار کیا۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کے چچا کا نام تھا، جس نے ان کے باپ کی وفات کے بعد پرورش کی تھی۔ قرآن نے اسی پر 'اب' (باپ) کا اطلاق کیا ہے۔[۱]

خاندان

حضرت ابراہیمؑ کا خاندان بہت معزز اور جاہ و منصب کا مالک تھا۔ آپ کے باپ کو شاہ وقت کے دربار میں تقرب حاصل تھا۔ دینوری نے لکھا ہے:

”نمرود نے اپنے خاندان سے سات افراد کو منتخب کر کے انھیں امور سلطنت میں اپنا معاون بنایا۔ ہر ایک کو ایک شعبے کا ذمے دار بنایا۔ حضرت ابراہیمؑ کا باپ آزر ان میں سے ایک تھا“[۲]

سفر بیا شار میں ہے کہ نمرود نے جب زمام حکومت سنبھالی تو اپنے لیے کچھ امراء کو منتخب کیا۔ اس نے تارح بن ناحور کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا اور اس کا مرتبہ تمام سرداروں سے بلند کیا“[۳]

ولادت

حضرت ابراہیمؑ کی ولادت کے ضمن میں مفسرین، مؤرخین اور اصحاب سوانح نے جو واقعات لکھے ہیں، ان کی جزئیات میں بہت سی بے سروپا اور خلاف عقل باتیں پائی جاتی ہیں۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر طبری، ۱۱/ ۴۶۵-۴۶۹، قصص الانبیاء ثعلبی ص ۶۳، مقالات سلیمان، سید سلیمان ندوی، جلد سوم، مقالہ قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات، ص ۱۹۲-۲۰۶

(۲) الاخبار الطوال، دینوری، ص ۱۰

(۳) سفر الیاشار۔ دیکھیے مقالہ داستانِ خلیل۔ ابوالجلال ندوی۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جلد ۶۷ شمارہ ۳ مارچ ۱۹۵۱ء

البتہ بحیثیت مجموعی انھیں قبول کیا جاسکتا ہے۔ ان کے مطابق نمرود کو کاہنوں اور نجومیوں نے خبر دی کہ ''اس سال آپ کے ملک میں ایک ایسے بچے کی پیدائش ہونے والی ہے، جو آپ کے دین کو بدل کر رکھ دے گا اور اس کے ہاتھوں آپ کی حکومت کا زوال مقدر ہے'' یہ سن کر نمرود گھبرا گیا۔ اس نے پورے ملک میں اپنے کارندے بھیج دیے اور انھیں حکم دیا کہ ہر بچے کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیں۔ اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ اس عرصے میں مرد اپنی بیویوں سے الگ رہیں یا حمل نہ ٹھہرنے پائے۔ لیکن اس کی تمام تدبیریں ناکام رہیں۔ اس کے کارندوں کو حضرت ابراہیمؑ کی ولادت کی بھنک نہ لگ سکی اور ان کی پرورش اتنی تیزی سے ہوئی کہ کچھ عرصہ کے بعد کسی کے گمان میں بھی نہ آیا کہ اس بچے کی پیدائش اس مدت میں ہوئی ہے جس کے بارے میں نجومیوں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔(۱)

قرآن مذکورہ بالا تفصیلات کے سلسلے میں خاموش ہے۔ اس سے حضرت ابراہیمؑ کی ولادت کے واقعے پر کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ اس میں اور حضرت موسیٰؑ کے قصۂ ولادت میں مماثلت پائی جاتی ہے، جس کا بیان قرآن میں موجود ہے۔ فرعون کو بھی اس کے نجومیوں نے خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے، جس کے ہاتھوں اس کی ہلاکت ہوگی اور اس کی سلطنت کا خاتمہ ہوگا۔ فرعون نے اس اندیشے سے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کروایا۔ لیکن اس کی تمام تدابیر کے باوجود موسیٰؑ اس کے دست تعدی سے محفوظ رہے۔ یہی نہیں بلکہ اللہ کی مشیت سے ان کی پرورش و پرداخت خود فرعون کے دربار میں ہوئی۔

بچپن

حضرت ابراہیمؑ کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی جو شرک، بت پرستی اور کواکب پرستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ آپ کا باپ نہ صرف بت پرست بلکہ بت گر بھی تھا اور اسے پروہت کا مقام حاصل تھا۔ کتاب یشوع میں ہے:

> ''خداوند اسرائیل کا خدا فرماتا ہے کہ تمہارے آباء یعنی ابرہام اور نحور کا باپ تارح وغیرہ قدیم زمانہ میں بڑے دریا کے پار رہتے اور دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے تھے''(۲)

---

(۱) قصۂ ولادت سے متعلق روایات کی تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ طبری، ۱/۲۳۳-۲۳۴، تفسیر طبری، ۱۱/۴۸۰-۴۸۱، تفسیر قرطبی، ۷/۲۴، زاد المسیر فی علم التفسیر، ابن الجوزی، ۳/۷۲-۷۳، قصص الانبیاء، ثعلبی ص ۶۳-۶۵، اور دوسری کتابیں۔

(۲) کتاب یشوع باب ۲۴: ۲

انجیل برنا باس میں ہے۔

''ابرہام کا باپ بت ساز تھا، جو جھوٹے خدا بناتا اور پوجتا تھا'' (۱)

''ہمارے باپ ابرہام کا باپ بے دین تھا، کیونکہ وہ باطل خدا بناتا اور پوجتا تھا'' (۲)

حضرت ابراہیمؑ نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو اپنے اردگرد بتوں کی پرستش ہوتے دیکھی۔ اپنے ماں باپ، افرادِ خاندان اور دوسرے لوگوں کو لکڑی، مٹی اور پتھر کے بتوں کے آگے سر جھکاتے اور ان سے مرادیں مانگتے ہوئے پایا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کا باپ قسم قسم کے بت بناتا اور انھیں پوجتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ لوگوں نے خدائی کو ان بتوں کے درمیان تقسیم کر رکھا ہے۔ کوئی طاقت و قوت کا خدا ہے۔ کوئی لذت و شہوت کی دیوی ہے۔ کوئی بارش برساتا ہے تو کوئی اولاد سے نوازتا ہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم پر پیدا کیا تھا۔ انھوں نے غور و تدبر کیا: کیا یہ مٹی پتھر کے بت خدا بن سکتے ہیں؟ یہ کھا پی سکتے ہیں نہ تو بول سکتے ہیں۔ ان پر مکھی بیٹھ جائے تو اسے ہٹا نہیں سکتے۔ جب یہ اپنے معاملے میں اتنے بے بس ہیں تو دوسروں کی حاجت روائی کیسے کر سکتے ہیں؟ اگر یہ حقیقی معبود نہیں تو پھر کون ہے؟ عین ممکن ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے ماں باپ سے دریافت کیا ہو؟ اور ان کے واسطے سے ان سوالات کو حل کرنے کی کوشش کی ہو۔ بعض کتب میں اس موضوع پر ان کی بعض گفتگوئیں منقول ہیں۔ ثعلبی نے لکھا ہے:

''ابراہیمؑ جب ذرا بڑے ہوئے تو ایک مرتبہ انھوں نے اپنی ماں سے دریافت کیا۔

میرا رب (پالنے والا) کون ہے؟

ماں: میں

ابراہیمؑ: آپ کا رب کون ہے؟

ماں: تیرا باپ

ابراہیمؑ: میرے باپ کا رب کون ہے؟

ماں: نمرود

ابراہیمؑ: نمرود کا رب کون ہے؟

یہ سن کر ماں نے انھیں ڈانٹ کر چپ کر دیا۔ جب ان کا باپ آیا تو ماں نے شکایت کی

---

(۱) برنا باس کی انجیل، اردو ترجمہ آسی ضیائی، فصل ۲۶ ص ۵۴

(۲) حوالہ سابق، فصل ۷۹ ص ۱۲۱

کہ آپ کا بیٹا ایسے سوالات کرتا ہے۔ باپ نے دریافت کیا۔ جب تصدیق ہوگئی تو اس نے بیٹے کی پٹائی کی اور تنبیہ کی کہ آئندہ ایسے سوالات نہ کرنا۔[1]

انجیل برنباس میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے باپ کے درمیان ہونے والا ایک مکالمہ یہ مذکور ہے:

''ابرہام سات سال کا تھا جب وہ خدا کی جستجو کرنے لگا۔ سو ایک دن اس نے اپنے باپ سے کہا: ابا آدمی کس نے بنایا؟

احمق باپ نے جواب دیا: آدمی نے، کیونکہ تجھے میں نے بنایا ہے اور مجھے میرے باپ نے بنایا۔

ابرہام نے جواب دیا: ابا ایسا تو نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے ایک بوڑھے کو رو رو کر کہتے سنا: اے میرے خدا! تو نے مجھے بچے کیوں نہ دیے؟

اس کے باپ نے جواب دیا: یہ سچ ہے بیٹا کہ آدمی کو آدمی بنانے میں خدا مدد کرتا ہے، مگر وہ اس میں خود ہاتھ نہیں ڈالتا۔ بس اتنا ضروری ہے کہ آدمی اپنے خدا سے دعائیں مانگے اور اسے بڑے اور بھیڑیں چڑھائے تو اس کا خدا اس کی مدد کرے گا''

ابرہام نے جواب میں کہا: خدا کتنے ہیں ابا؟

بوڑھے نے جواب دیا: بے گنتی ہیں بیٹا

تب ابرہام نے کہا: ابا! اگر میں ایک خدا کی خدمت کروں اور دوسرا مجھے ضرر پہنچانا چاہے کہ میں اس کی خدمت نہیں کرتا، تو میں کیا کروں گا؟ ہر صورت میں ان کے درمیان ناچاقی ہوگی اور یوں خداؤں میں جنگ چھڑ جائے گی اور اگر اتفاق سے جو خدا مجھے ضرر پہنچانا چاہتا ہے، وہ میرے اپنے خدا کو قتل کر دے تو میں کیا کروں گا؟ یہ یقینی ہے کہ وہ مجھے بھی قتل کر دے گا۔

بوڑھے نے ہنس کر جواب دیا: بیٹا ڈر نہیں۔ کوئی خدا دوسرے خدا سے جنگ نہیں چھیڑتا بلکہ بڑے معبد میں خدائے کبیر بعل کے علاوہ ایک ہزار خدا اور ہیں۔ اور میں اب ستر برس کا ہونے آیا پھر بھی میں نے کبھی نہ دیکھا کہ کسی ایک خدا نے دوسرے خدا کو مارا ہو۔ اور بے شک تمام آدمی ایک ہی خدا کی خدمت نہیں کرتے بلکہ کوئی آدمی کسی کی خدمت کرتا ہے اور کوئی کسی کی۔

(1) قصص الانبیاء، ثعلبی، 1/78

ابرہام نے جواب میں کہا: تو ان کی آپس میں صلح رہتی ہے؟
اس کے باپ نے کہا: ہاں رہتی ہے
تب ابرہام نے کہا: ابا خدا کیسے ہوتے ہیں؟

بوڑھے نے جواب دیا: بے وقوف، میں روز ایک خدا بناتا ہوں، جسے میں اوروں کے ہاتھ بیچ کر روٹی خریدتا ہوں۔ اور تو نہیں جانتا خدا کیسے ہوتے ہیں؟ اور اس وقت وہ ایک بت بنا رہا تھا۔ ''یہ'' وہ بولا ''چوبِ نخل کا ہے، یہ زیتون کا، یہ ننھا سا ہاتھی دانت کا ہے۔ دیکھ کتنا نفیس ہے۔ ایسا نہیں لگتا جیسے یہ زندہ ہو؟ سچ مچ اس میں بس سانس کی کسر ہے۔

ابرہام نے جواب میں کہا: اچھا تو ابا خدا بغیر سانس کے ہوتے ہیں؟ پھر وہ سانس دیتے کس طرح ہیں؟ اور خود بے جان ہوتے ہوئے، جان عطا کس طرح کرتے ہیں؟ ابا یہ یقینی ہے کہ یہ خدا نہیں ہیں یا ہو سکتے۔

بوڑھے نے ان الفاظ پر جھلا کر کہا: اگر تو سیانی عمر کا ہوتا تو میں اس کلہاڑے سے تیرا سر پھاڑ دیتا۔ بس خاموش رہ، تو ابھی ناسمجھ ہے۔

ابرہام نے جواب دیا: ابا اگر خدا انسان بنانے میں مدد کرتے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی خدا بنائیں؟ اور اگر خدا لکڑی کے بنے ہوتے ہیں تو لکڑی کا جلانا بڑا گناہ ہوا۔ مگر ابا یہ بتا یہ کیا بات ہے کہ تو نے اتنے بہت سے خدا بنائے مگر خداؤں نے اتنے بہت سے بچے بنانے میں تیری مدد نہ کی کہ تو دنیا کا سب سے طاقت ور آدمی بن جاتا؟

باپ اپنے بیٹے کی یہ باتیں سن کر آپے سے باہر ہو گیا''(1)

اگرچہ ان روایات کا کوئی استناد نہیں ہے، لیکن حضرت ابراہیمؑ کی سلامت طبع، ذہانت اور غور و تدبر کی بنا پر عین ممکن ہے کہ ان کی، اپنے ماں باپ سے اس انداز کی گفتگو ہوتی رہی ہو۔

قرآن کی ایک آیت سے اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کی بت پرستی پر اس کی سخت مذمت کرتے تھے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (الانعام: ۷۴)

(۱) برناباس کی انجیل، فصل ۲۶، ص ۵۴-۵۶

ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا" کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں"

اس زمانے میں کواکب پرستی بھی زوروں پر تھی۔ لوگوں نے سورج، چاند اور سیاروں کو دیوتا بنا رکھا تھا اور انھیں امورِ کائنات میں دخیل سمجھتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ضرور ان میں بھی غور کیا ہوگا۔ کیا یہ مظاہر کائنات دیوتا بننے کی کچھ بھی صلاحیت رکھتے ہیں؟ ان کے طلوع اور غروب ہونے کا ایک وقت مقرر ہے۔ کیا یہ اپنی مرضی سے ان اوقات میں تبدیلی کر سکتے ہیں؟ دن کی روشنی میں ستارے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور چاند غائب ہو جاتا ہے اور رات آتے ہی سورج اوٹ میں چلا جاتا ہے۔ جب یہ مظاہر کائنات اس قدر بے ثبات ہیں اور یہ خود اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں تو یہ خدا کس طرح ہو سکتے ہیں؟ خدا تو وہ ہو سکتا ہے، جو قائم بالذات ہو۔ جو دوسروں کا محتاج نہ ہو بلکہ دوسرے اس کے محتاج ہوں۔ جو اپنے وجود و بقا کے لیے دوسروں کا احسان مند نہ ہو اور جس کا کائنات میں حکم چلتا ہو۔

آسمان و زمین کے ان مظاہر کے براہ راست مشاہدے اور ان میں گہرے تدبر و تفکر کے نتیجے میں حضرت ابراہیمؑ نے حقیقت تک رسائی حاصل کرلی، اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی دست گیری اور رہنمائی فرمائی۔ ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝ (الانعام:۷۵)

ابراہیمؑ کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لیے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

بعثت

قرآن کریم سے حضرت ابراہیمؑ کی ماقبل بعثت کی زندگی پر روشنی نہیں پڑتی اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کس عمر میں نبوت سے سرفراز فرمایا تھا۔ البتہ ایک آیت سے اشارہ ملتا ہے کہ جب آپ کی دعوت اپنے شباب پر تھی اور مخالفتوں کا بازار گرم تھا، اس وقت آپ جوانی کی عمر کو پہنچے ہوئے تھے۔ قوم کے لوگ ایک موقع پر کہتے ہیں۔

سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ۝ؕ (الانبیاء:۶۰)

ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا جس کا نام ابراہیمؑ ہے۔

عربی زبان میں 'فتی' نوجوان کو کہتے ہیں[1] حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو جوانی کی عمر میں نبوت سے سرفراز کیا ہے' دلیل میں انھوں نے یہی آیت پیش کی۔[2]

بعثت سے سرفراز کیے جانے کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کی دعوت میں موجود ہے۔ وہ اپنے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے پاس ایک ایسا 'علم' بھیجا ہے، جو آپ کو حاصل نہیں ہے۔ اس لیے صحیح راستہ پانے کے لیے میرے پیچھے چلنا اور میری بات ماننا ضروری ہے۔

يَآبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَآءَنِىْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِىْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّاo (مریم:۴۳)

ابا جان، میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ جس ذات نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور ان کا نظام چلا رہا ہے، وہی تمہارا بھی رب ہے اور میں اس کی گواہی دیتا ہوں۔

بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِىْ فَطَرَهُنَّ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَo (الانبیاء:۵۶)

نہیں، بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے، جو زمین اور آسمانوں کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔

اطمینانِ قلب کے لیے ایک درخواست

قرآن نے حضرت ابراہیمؑ سے تعلق رکھنے والے ایک واقعہ کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اَرِنِىْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌo (البقرہ:۲۶۰)

---

(۱) راغب اصفہانی نے لکھا ہے۔ الفتی: الطری من الشباب، المفردات مادہ 'فتی'۔

(۲) تفسیر قرطبی، ۱۱/۲۹۹

اور وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے، جب ابراہیمؑ نے کہا تھا: ''میرے مالک مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے فرمایا: کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا: ''ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے فرمایا: اچھا تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے، پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار۔ وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔

یہ واقعہ کس زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ مفسرین نے اس کی صراحت نہیں کی ہے۔ البتہ مولانا امین احسن اصلاحی نے باجمال ذکر کیا ہے کہ اس کا تعلق ان کی زندگی کے ابتدائی دور سے ہو سکتا ہے۔ [۱] امام رازی نے حضرت ابراہیمؑ کے سوال کے اسباب پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ واقعہ نبوت کے ابتدائی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ [۲]

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے یہ جاننے کی خواہش ظاہر کی کہ وہ حشر میں مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہیں قیامت کا اعتقاد نہیں تھا یا انہیں مردوں کے دوبارہ زندہ ہو سکنے میں کچھ شک و تردّد تھا۔ بلکہ وہ اس سلسلے میں شرحِ صدر اور اطمینان قلب کے خواہش مند تھے۔ اور یہ چیز اسی صورت میں حاصل ہو سکتی تھی، جب اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے۔ ایک حدیث سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

نحن أحقّ بالشک من ابراهيم اذ قال ربّ أرني كيف تحيي الموتى الآية [۳]

ابراہیمؑ نے کہا تھا: میرے رب تو مجھے دکھا دے تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اگر یہ شک ہے تو ان سے بڑھ کر شک کرنے والے تو ہم ہیں۔

یعنی جس طرح ہمیں اس بات کا قطعی یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا اور

---

(۱) تدبر قرآن، ۵۶۲/۱

(۲) تفسیر کبیر، ۳۴۳/۲

(۳) صحیح بخاری، کتاب الأنبیاء، باب قول اللہ عزوجل رب أرنی کیف تحیی الموتی

اس میں ہمیں کچھ شک نہیں ہے، اسی طرح ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ابراہیمؑ کو بھی اس معاملے میں ادنیٰ سا شک نہیں تھا۔[1]

حضرت ابراہیمؑ کی اس درخواست کے جواب میں انھیں حکم دیا گیا کہ چار پرندے لے کر انھیں اپنے سے خوب مانوس کرلو۔ پھر ان کا ایک ایک جزء اپنے گرد وپیش کی پہاڑیوں پر رکھ دو پھر انھیں پکارو، وہ تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔

چار پرندوں کو لینے کی ہدایت غالباً اس لیے کی گئی تھی تاکہ چاروں سمتوں سے ان کے مجتمع ہونے کا مشاہدہ کرا دیا جائے۔ اور مانوس کرنے کی ہدایت اس لیے دی گئی تھی کہ وہ ان کو اچھی طرح پہچان رکھیں تاکہ ان کو اس امر میں کوئی اشتباہ نہ رہے کہ ان کی آواز پر آنے والے وہی پرندے ہیں، جنھیں انھوں نے پالا اور مانوس کر رکھا تھا، دوسرے نہیں۔

''ہر پہاڑ پر پرندوں کا ایک ایک جزء'' رکھنے کا کیا مطلب ہے؟ مفسرین کی غالب اکثریت اس طرف گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا تھا کہ ان پرندوں کو ذبح کر کے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے گوشت اور پر وغیرہ کا ایک ایک حصہ ایک ایک پہاڑی پر رکھ دیں، پھر انھیں پکاریں، وہ قدرت الٰہی سے زندہ ہو کر دوڑے چلے آئیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کا سوال مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کے بارے میں تھا۔ جواب میں انھیں دکھا دیا گیا کہ جس طرح یہ پرندے اپنے مالک کی آواز پر زندہ ہو گئے، اسی طرح قیامت کے دن اللہ کے حکم سے مردے بھی زندہ ہو جائیں گے۔ یہ مفسرین ''ذبح کرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے'' کا مفہوم محذوف مانتے ہیں یا کہتے ہیں کہ لفظ ''فصرھنّ'' کے ایک معنیٰ ''ٹکڑے کرنے'' کے بھی آتے ہیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیت میں پرندوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ان کے ایک ایک جزء کو ایک ایک پہاڑی پر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایک پرندے کو ایک ایک پہاڑی پر بٹھا دیا جائے۔ جس طرح سدھائے ہوئے پرندے اپنے مالک کی آواز پر آجاتے ہیں اسی طرح قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی پکار پر مردے جی اٹھیں گے اور میدان حشر کی طرف دوڑنے لگیں گے۔ یہ احیاء موتی کی محض ایک تمثیل ہے۔[2]

(۱) فتح الباری، ۶/۴۱۲

(۲) یہ رائے قدیم مفسرین میں ابومسلم اصفہانی اور متاخرین میں مولانا حمید الدین فراہی کی ہے۔

بعض مفسرین نے "حیات وموت" کو بھی مجازی معنیٰ میں لیا ہے۔ان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک گروہ بھی ایسا نہ تھا، جس میں قبولیت حق کی استعداد دکھائی دیتی ہو۔ یہ حالت دیکھ کر انھوں نے کہا "خدایا تو کیوں کر اس موت کو زندگی سے بدل دے گا؟ اس پر اللہ نے دعوت حق کی انقلاب انگیز حقیقت پرندوں کی مثال سے واضح کر دی۔ اگر تم ایک پرند کو کچھ دنوں تک اپنے پاس رکھ کر ایسا تربیت یافتہ بنا لے سکتے ہو کہ تمہاری آواز سنتا اور تمہارے بلانے پر اڑتا ہوا آ جا سکتا ہے تو کیا گم راہ اور متوحش انسان دعوت حق کی تعلیم و تربیت سے اس درجہ اثر پزیر نہیں ہو سکتے کہ تمہاری صدائیں سنیں اور ان کا جواب دیں؟ (۱)

(۱) ترجمان القرآن۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ۲/۲۴۰

دعوت

قرآن کریم سے حضرت ابراہیمؑ کی دعوت پر تفصیل سے روشنی پڑتی ہے۔آپ نے اپنے باپ کو دعوت دی۔اپنی قوم سے بھی خطاب کیا اور شاہِ وقت کے دربار تک بھی اللہ کا پیغام پہنچایا۔آپ نے دل سوزی اور خیر خواہی کا اظہار کیا۔افہام وتفہیم کا طریقہ اپنایا اور اتمام حجت کے لیے سخت ترین انداز بھی اختیار کیا۔قرآن کی روشنی میں آپ کی دعوت کا مطالعہ دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے عبرت ونصیحت کا بڑا سامان رکھتا ہے۔

باپ کو دعوت

حضرت ابراہیمؑ کو بارگاہ الٰہی سے نبوت سے نوازا گیا اور حکم دیا گیا کہ اللہ کے گمراہ بندوں تک اس کا پیغام حق پہنچائیں تو انھوں نے سب سے پہلے اپنے باپ کو مخاطب کیا اور اس کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔قرآن سے (اور بائبل سے بھی) دعوت ابراہیمی کے ضمن میں حضرت ابراہیمؑ کی ماں کے کردار پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ہوسکتا ہے بعثت سے قبل ہی ماں کا انتقال ہوگیا ہو۔

قرآن میں جن مقامات پر حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کی تفصیل آئی ہے،ان میں سے بیشتر میں ان کے،اپنے باپ اور قوم دونوں سے خطاب کا ذکر ہے۔سوائے دو مقامات کے (الانعام:۷۴،مریم:۴۲) کہ ان میں صرف باپ سے خطاب ہے۔اس سے اشارہ ملتا ہے کہ دعوت کے ابتدائی مرحلے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ تک حق کا پیغام پہنچایا۔اس کے سامنے غیر اللہ کی بے بسی واضح کی،اسے شیطان کی غلامی چھوڑ کر رحمٰن کی غلامی میں آنے کی دعوت دی اور آخرت کی پکڑ سے ڈرایا:

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَآأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا ○ يَآ أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ○ يَآأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا ○ يَآأَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ○

(مریم: ۴۲-۴۵)

(انہیں ذرا اس موقع کی یاد دلاؤ) جب اس نے اپنے باپ سے کہا:
ابا جان! آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابا جان میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔

ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو دین کی اساسیات پر ایمان لانے کی دعوت دی اور توحید، رسالت اور آخرت کا واضح تصور پیش کیا۔ انھوں نے باپ کا پورا ادب و احترام ملحوظ رکھا اور انتہائی اپنائیت اور دل سوزی کے ساتھ سمجھایا۔ انداز تخاطب سے محبت، اپنائیت، خلوص اور خیر خواہی کے جن احساسات کا اظہار ہو رہا ہے وہ اہل زبان سے مخفی نہیں۔ مگر اس کا جواب باپ نے ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکیوں سے دیا۔

قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَآإِبْرَاهِيمُ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ○

(مریم: ۴۶)

(باپ نے) کہا "ابراہیمؑ کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگ سار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔

'رجم' کے لغوی معنی سنگ سار کرنے اور قتل کرنے کے آتے ہیں۔ استعارةً برا بھلا کہنے اور دھتکارنے کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں اس سے دونوں معانی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ (۱) "ملیا" کی مفسرین نے دو توجیہیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے معنی ہیں طویل عرصے یا ہمیشہ کے لئے تم میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ، اس کے دوسرے معنی ہیں بچنا، محفوظ رہنا، یعنی

(۱) المفردات فی غریب القرآن، اصفہانی، ص ۱۸۹ مادہ رجم

اگر تم میرے سزا سے بچنا چاہتے ہو تو میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ امام طبری نے موخر الذکر معنی کو ترجیح دی ہے۔(1)

باپ کے ترش رویے کے باوجود حضرت ابراہیمؑ برابر اسے حق کی دعوت دیتے رہے، چنانچہ انھوں نے قوم کو دعوت دینے کے ساتھ باپ کو دعوت دینا ترک نہ کیا۔ بلکہ دونوں کو بیک وقت خطاب کیا۔

قوم کو دعوت

دعوت کے دوسرے مرحلے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم تک اللہ کا پیغام پہنچایا۔ آپ کی قوم اپنے ہی تراشیدہ بتوں کے آگے سر جھکاتی تھی۔ انہیں اپنا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتی تھی۔ اپنے اس عمل کی ان کے پاس اگر کوئی دلیل تھی تو بس یہ کہ اپنے باپ دادا کو صدیوں سے انھوں نے ایسا ہی کرتے دیکھا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان کے عقیدۂ باطل پر کاری ضرب لگائی، ان کی گمراہی واضح کی اور ان کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی:

اِذْقَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ○ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ○ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ○ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○ (الانبیاء: ۵۲-۵۶)

(یاد کرو وہ موقع) جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا: "یہ مورتیاں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو"؟ انھوں نے جواب دیا": ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے" اس نے کہا: "تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" انھوں نے کہا: "کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے، جو زمین اور آسمانوں کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید سن کر ان کی قوم کو یقین نہ آیا کہ وہ اس میں سنجیدہ ہیں۔ اس نے دریافت کیا کہ باپ دادا کے رسم و رواج اور طریقے کے

(1) تفسیر جامع البیان، طبری، ۱۶/۶۱

برخلاف ایک دوسرا طریقہ پیش کر کے کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ قوم نے یہ بات آغاز دعوت میں کہی تھی۔

قرآن میں ایک دوسرے موقع پر حضرت ابراہیمؑ اور ان کی قوم کے درمیان ہونے والی گفتگو اور حضرت ابراہیمؑ کی دعوت تفصیل سے مذکور ہے:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۝ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۝ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ (الشعرآء: ۷۰-۸۲)

اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا: یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: کچھ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور انھی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں'' اس نے پوچھا: کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ اس پر ابراہیمؑ نے کہا: کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) ان چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمھارے پچھلے باپ دادا بجالاتے رہے؟ میرے تو یہ سب دشمن ہیں۔ بجز ایک رب العالمین کے، جس نے مجھے پیدا کیا۔ پھر وہی رہنمائی فرماتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرمادے گا۔

ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ نے تفصیل سے واضح کیا ہے کہ کسی کے معبود ہونے کے لیے اس کا کن صفات سے متصف ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ چونکہ ''رب العالمین'' میں یہ صفات پائی جاتی ہیں، اس لیے میں اس کی عبادت بجالاتا ہوں اور چونکہ یہ بت ان تمام اوصاف سے محروم ہیں اس لیے ان کی پرستش میں میں سراسر خسارہ دیکھتا ہوں۔ یہ سب میرے دشمن ہیں۔

اس تعبیر میں بھی بڑی بلاغت پائی جاتی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس کی یوں وضاحت کی ہے:

"یہاں حکمت تبلیغ کا بھی یہ نکتہ قابل توجہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمہارے دشمن ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ وہ میرے دشمن ہیں۔ اگر وہ کہتے کہ یہ تمہارے دشمن ہیں تو مخاطب کے لیے ضد میں مبتلا ہو جانے کا زیادہ موقع تھا۔ وہ اس بحث میں پڑ جاتا کہ بتاؤ وہ ہمارے دشمن کیسے ہو گئے۔ بخلاف اس کے جب انھوں نے کہا کہ وہ میرے دشمن ہیں تو اس سے مخاطب کیلئے یہ سوچنے کا موقع پیدا ہو گیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنے بھلے اور برے کی فکر کرے جس طرح ابراہیمؑ نے کی ہے۔ اس طریقے سے حضرت ابراہیمؑ نے گویا ہر انسان کے اس فطری جذبے سے اپیل کی جس کی بنا پر وہ خود اپنا خیر خواہ ہوتا ہے اور جان بوجھ کر کبھی اپنا برا نہیں چاہتا۔ انھوں نے اسے بتایا کہ میں تو ان کی عبادت میں سراسر نقصان دیکھتا ہوں اور دیدہ و دانستہ میں اپنی بدخواہی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا دیکھ لو کہ میں خود ان کی بندگی و پرستش سے قطعی اجتناب کرتا ہوں۔ اس کے بعد مخاطب یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس کی اپنی بھلائی کس چیز میں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ نادانستہ اپنی بدخواہی کر رہا ہو"(1)

ایک موقعے پر حضرت ابراہیمؑ کی دعوت ان الفاظ میں مذکور ہے:

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (العنکبوت:۱۶-۱۷)

اور ابراہیمؑ کو بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پوج رہے ہو، وہ تو محض بت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو، وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔

"ان چند فقروں میں حضرت ابراہیمؑ نے بت پرستی کے خلاف تمام معقول دلائل

(1) تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی۔ ۳/۵۰۱-۵۰۲۔ امام رازیؒ نے بھی تبلیغ کی اسی حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دیکھئے تفسیر کبیر ۶/۴۱۲

سمیٹ کر رکھ دیے ہیں۔ کسی کو معبود بنانے کے لیے لامحالہ کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ ایک معقول وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں معبودیت کا کوئی استحقاق رکھتا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ آدمی کا خالق ہو اور آدمی اپنے وجود کے لیے اس کا رہین منّت ہو۔ تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ آدمی کی پرورش کا سامان کرتا ہو اور اسے رزق یعنی متاع زیست بہم پہنچاتا ہو۔ چوتھی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ آدمی کا مستقبل اس کی عنایات سے وابستہ ہو اور آدمی کو اندیشہ ہو کہ اس کی ناراضگی مول لے کر وہ اپنا انجام خراب کر لے گا۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ ان چاروں وجوہ میں سے کوئی وجہ بھی بت پرستی کے حق میں نہیں ہے، بلکہ ہر ایک خالص خدا پرستی کا تقاضا کرتی ہے "یہ محض بت ہیں" کہہ کر انھوں نے پہلی وجہ کو ختم کر دیا۔ کیونکہ جو نرا بت ہو اس کو معبود ہونے کا آخر کیا ذاتی استحقاق حاصل ہوسکتا ہے۔ پھر یہ کہہ کر کہ "تم ان کے خالق ہو" دوسری وجہ بھی ختم کر دی۔ اس کے بعد تیسری وجہ کو یہ فرما کر ختم کیا کہ وہ تمھیں کسی نوعیت کا کچھ بھی رزق نہیں دے سکتے اور آخری بات یہ ارشاد فرمائی کہ تمھیں پلٹنا خدا کی طرف ہے نہ کہ ان بتوں کی طرف، اس لیے تمھارا انجام اور تمھاری عاقبت سنوارنا یا بگاڑنا بھی ان کے اختیار میں نہیں، صرف خدا کے اختیار میں ہے۔ اس طرح شرک کا پورا ابطال کر کے حضرت والا نے یہ بات ان پر واضح کر دی کہ جتنے وجوہ سے بھی انسان کسی کو معبود قرار دے سکتا ہے وہ سب کے سب اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت کے مقتضی نہیں ہیں۔"(۱)

ایک موقعے پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور قوم کو مخاطب کر کے فرمایا:

اِذْقَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۚ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِیْدُوْنَ ۚ فَمَاظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (الصافات:۸۵-۸۷)

اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا "یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو۔ آخر رب العالمین کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے؟

استدراج۔ نیا اندازِ دعوت

یہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم سورج، چاند اور ستاروں کو بھی پوجتی تھی۔ حضرت

(۱) تفہیم القرآن،۳/۶۸۸

ابراہیمؑ نے سوچا کہ ان کے اس عقیدے پر بھی ضرب لگائی جائے اور ان پر واضح کیا جائے کہ یہ معبود نہیں ہیں بلکہ خود اپنے پیدا کرنے والے کے غلام اور اس کی مشیت کے پابند ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے استدراج کا طریقہ اختیار کیا۔ ''استدراج'' کا مطلب یہ ہے کہ مخاطب کو اس طرح درجہ بدرجہ قائل کیا جائے کہ اس کے سامنے ایک ایک کر کے اقرار کے تمام دروازے بند ہوتے جائیں اور ہٹ دھرمی کے علاوہ پیش کردہ دلیل کا انکار کرنے کی اور کوئی صورت نہ بچے۔ قرآن نے اس واقعے کو تفصیل سے بیان کیا ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (الانعام: ۷۶-۷۹)

چنانچہ جب اس پر رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا، یہ ہے میرا رب، مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو ابراہیمؑ پکار اٹھا: اے برادران قوم! میں ان سب سے بے زار ہوں، جنھیں تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا، جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں''۔

یہ آیات قرآن کی مشکل آیات میں سے ہیں۔ قدیم اور جدید تمام مفسرین کے درمیان ان کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ کیا حضرت ابراہیمؑ مظاہر کائنات میں خود غور و تدبر کر رہے تھے کہ ستارہ، چاند اور سورج کے طلوع ہونے پر وہ یہ سوچنے لگے کہ کیا یہ معبود ہو سکتے ہیں؟ لیکن ان کے غروب اور روپوش ہو جانے پر انہیں یقین ہو گیا کہ یہ معبود نہیں ہو سکتے، بلکہ معبود تو وہ ذات ہے

جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔ یا یہ حجت طراز اور جھگڑالو قوم کو توحید کا قائل کرنے کی ایک انوکھی تدبیر تھی اور درحقیقت اس وقت وہ اپنی قوم سے مناظرہ کر رہے تھے؟

مفسرین کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ یہ آیات حضرت ابراہیمؑ کے فکری ارتقاء پر دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی ولادت اور پرورش ایک غار میں ہوئی تھی جہاں وہ سن رشد کو پہنچنے تک رہے۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب انھوں نے پہلی مرتبہ غار سے نکلنے پر ان اجرام سماوی کو دیکھا تھا۔ جب کہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ فرض کرنے کہ ضرورت نہیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز آدمی کی نگاہوں سے گزرتی رہتی ہے لیکن اس کے ذہن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ اور کسی خاص لمحے میں اس پر نظر پڑتی ہے تو فکر کے دریچے کھل جاتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ دن رات ان کے سامنے گزرتے رہتے تھے، لیکن ایک خاص دن تارے، چاند اور سورج کے مشاہدے نے انھیں توحید الٰہ کی حقیقت تک پہنچا دیا۔ بہرحال اس گروہ کے تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ناظر کی حیثیت سے پیش آیا تھا۔ اس کے قائلین میں قدیم مفسرین میں ابن جریر طبریؒ قابل ذکر ہیں اور جدید مفسرین میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، سید قطب شہیدؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ (۱)

مفسرین کا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے اپنی قوم کے ساتھ مناظرے کا واقعہ ہے۔ وہ بڑی مناظرہ باز واقع ہوئی تھی۔ اوّلاً تو کوئی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتی اور اگر کبھی اس کا موقع آتا تو فوراً مناظرہ بازی پر آمادہ ہو جاتی تھی۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے اس کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرنے کے لیے استدراج کا طریقہ اپنایا۔

ایک رات انھوں نے ایک چمکتا ہوا ستارہ دیکھا تو بولے ''یہ میرا رب ہے'' یہ بات انھوں نے اس طرح فرمائی ہوگی کہ دوسرے لوگوں کے کانوں میں پڑ جائے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو اسی انداز میں کہ دوسرے لوگ بھی سن لیں، فرمایا: کہ ''میں ڈوب جانے والوں سے تعلق

(۱) دیکھئے تفسیر طبری، ۱۱/۴۸۵-۴۸۷، قصص و مسائل۔ عبدالماجد دریابادی، فی ظلال القرآن۔ سید قطب، تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی۔ ۱/۵۵۶-۵۵۹۔ رسائل و مسائل۔ مولانا مودودی، ۱/۱۸-۲۱، ۵/۲۰-۲۵۔ شاہ ولی اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ دیکھئے تاویل الاحادیث ص ۲۰۔

خاطر نہیں رکھتا'' یہ بات چونکہ انھوں نے قوم کے لوگوں کو براہ راست مخاطب کر کے نہیں فرمائی تھی، اس لیے وہ مشتعل نہیں ہوئے۔ البتہ سوچ میں ضرور پڑ گئے ہوں گے۔ پھر چاند کو دیکھ کر انھوں نے اسی انداز میں وہی بات کہی جو تارے کو دیکھ کر کہی تھی۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو دوسروں کو سناتے ہوئے خود کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا'' اسی طرح ایک موقعے پر انھوں نے سورج کو دیکھ کر وہی بات دوسروں کو سناتے ہوئے فرمائی جو تارے اور چاند کو دیکھ کر فرمائی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی اضافہ کیا کہ ''یہ سب سے بڑا ہے'' پھر جب وہ ڈوب گیا تو آپ نے پرزور اسلوب میں شرک سے براءت کا اعلان کر دیا۔ یہاں بھی آپ نے وضاحت تو اپنے متعلق کی لیکن چونکہ اب وقت آ گیا تھا کہ قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑا جائے، اس لئے آپ نے براہ راست اس سے خطاب کیا اور فرمایا: اے میری قوم کے لوگو! میں ان چیزوں سے براءت ظاہر کرتا ہوں، جنھیں تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے اپنا رخ اس ہستی کی جانب پھیر لیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ میں اس کی طرف یکسو ہوں اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تینوں جوابات سے واضح طور پر دعوت توحید کے بتدریج ارتقاء کا اظہار ہوتا ہے۔ ستارے کے ڈوبنے پر انھوں نے جو بات کہی تھی، چاند کے ڈوبنے پر اس سے آگے کی بات فرمائی اور پھر سورج کے ڈوبنے پر مزید وضاحت کے ساتھ شرک سے براءت کا اعلان کیا اور توحید کی تعلیم پیش کی۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم تلملا اٹھی۔ دعوت توحید کے جواب میں وہ بحث و مجادلہ پر اتر آئی۔ اپنے معبودوں سے ڈرانے دھمکانے لگی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ تمہارے یہ معبود کسی کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے:

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ○ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ۚ

(الانعام: ۸۰-۸۱)

اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا: ''کیا تم لوگ اللہ کے معاملے

میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھادی ہے اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔ ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہوسکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔

مذکورہ آیات کی یہ تاویل بیشتر مفسرین نے اختیار کی ہے۔ قدیم مفسرین میں ابن کثیرؒ اور زمخشریؒ قابل ذکر ہیں اور جدید مفسرین میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اس نقطہ نظر کو مدلل پیش کیا ہے۔ (۱)

سیاق وسباق سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے:

۱۔ ماقبل آیت (۷۴) میں حضرت ابراہیمؑ کا خطاب اپنے باپ سے تھا۔ اور انھوں نے اس کی بت پرستی کو گمراہی قرار دیا تھا۔ اگلی آیات کو کذلك (اسی طرح) سے مربوط کیا گیا ہے۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ ان میں بھی دراصل وہ مناظرہ ہی کررہے تھے۔

۲۔ چاند کے ڈوب جانے کے بعد انھوں نے فرمایا تھا: ''اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا ہوتا'' (آیت:۷۷) اس سے واضح ہے کہ وہ اپنے رب کو تلاش نہیں کررہے تھے بلکہ ان کا پہلے سے اس پر ایمان تھا۔

۳۔ یہ معاملہ قوم سے وابستہ تھا، اسی وجہ سے انھوں نے تیسری مرتبہ سورج ڈوبنے کے بعد قوم سے خطاب کرتے ہوئے شرک سے براءت کا اعلان کیا تھا (آیت:۷۸) اگر یہ خود ان کے فکری ارتقاء کا معاملہ تھا تو قوم سے خطاب کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

۴۔ یہ سب سن کر ان کی قوم نے دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے بجائے لڑنا جھگڑنا شروع کردیا۔ (آیت ۸۰) اگر ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ کے ذاتی واردات بیان ہوئے ہیں تو معًا بعد کی آیات میں قوم کے بحث ومجادلہ کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

۵۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس گفتگو کو، اللہ تعالیٰ نے، ان کی قوم کے مقابلے میں اپنی جانب سے حجت قرار دیا: تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ (الانعام:۸۳) (یہ تھی ہماری وہ حجت

(۱) تفسیر ابن کثیر ۲/۱۵۱، کشاف۔ زمخشری، ۲/۳۰-۳۳، تدبر قرآن۔ امین احسن اصلاحی، ۳/ ۸۸-۱۰۰

جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی) 'علی قومه' کے الفاظ سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ قوم سے مناظرے کا واقعہ تھا، جس میں حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کی تائید سے حجت قائم کردی۔

اتمام حجت

حضرت ابراہیمؑ کی پیہم دعوت کا، ان کی قوم پر مطلق اثر نہ ہوا۔ بت پرستی ان میں رچ بس گئی تھی۔ وہ اپنے تراشیدہ معبودوں کے خلاف کوئی بات سننے کے روادار نہ تھے۔ ایسی صورت میں حضرت ابراہیمؑ نے ایک منصوبہ بنایا کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے بتوں کی بے بسی دیکھ لیں اور انھیں یقین ہو جائے کہ وہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ ایک اجتماع کے موقعے پر انھوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا:

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ۝ (الانبياء:۵۷)

اور خدا کی قسم تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا۔

قوم کے لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اس بات کو سمجھ نہیں پائے یا ان کی دھمکی کو خاطر میں نہیں لائے اور اسے دیوانے کی بڑ سمجھی۔ کچھ عرصے کے بعد ایک شب آبادی سے باہر کوئی میلہ یا مذہبی تہوار تھا۔ بعض لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب انھیں خبر دی کہ وہ بیمار ہیں تو انھوں نے چلنے پر اصرار نہیں کیا اور چھوڑ کر چلے گئے (الصافات:۹۰) اس وقت حضرت ابراہیمؑ کو اپنے خفیہ منصوبے پر عمل کرنے کا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا۔ وہ بت خانے میں گھس گئے۔ وہاں دیکھا کہ بتوں کے سامنے برکت کے لیے کھانے رکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے تمسخر کے انداز میں فرمایا: ''کھاتے کیوں نہیں؟ ارے، کچھ بولتے بھی نہیں'' پھر سب بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا۔ اس کو چھوڑنے کی ایک مصلحت تھی۔ اس کے ذریعے وہ دعوت وتبلیغ کا ایک موقع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ قوم کے لوگ جب میلے سے واپس آکر بت خانے میں گئے تو اپنے معبودوں کا یہ حشر دیکھ کر غیظ و غضب سے بھر گئے۔ انھوں نے کہا: ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کس نے جسارت کی ہے؟ بعض لوگوں نے کہا کہ ابراہیمؑ نامی ایک نوجوان ہے، جو ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے اور اس نے ان کے خلاف ایک خفیہ تدبیر کی دھمکی بھی دی تھی۔ ہو نہ ہو یہ اسی کی کارروائی معلوم ہوتی ہے۔

قوم کے سربراہوں نے حکم دیا کہ ابراہیمؑ کو عوام کے سامنے لا کر اس معاملے میں پوچھ گچھ کی جائے۔ چوں کہ مذہبی حیثیت سے یہ ایک سنگین جرم تھا، اس وجہ سے انھوں نے چاہا کہ اس کی تحقیقات عوام کے سامنے ہوں تاکہ ان پر اس جرم کی شناعت بھی واضح ہو اور جرم ثابت ہو جانے کے بعد مجرم کو جو سخت سزا دی جائے اس سے سب عبرت حاصل کریں۔ ابراہیمؑ کو عوام کے سامنے پیش کیا گیا اور ان سے سوال ہوا ''کیا تم نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ جرم کیا ہے اے ابراہیمؑ؟'' حضرت ابراہیمؑ تو اسی موقع کے منتظر تھے۔ انھوں نے جواب دیا:

بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ○ (الانبیاء:۶۳)

بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ جواب قوم کے عقائد پر زبردست وار تھا۔ اس میں جو طنز و تعریض اور تضحیک پوشیدہ ہے، وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ انھوں نے فرمایا: یہ تو بڑے صاحب کی کارستانی معلوم ہوتی ہے کہ کسی بات پر ناراض ہو کر انھوں نے سب چھوٹوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ تم لوگ مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو؟ خود انہی معبودوں سے کیوں نہیں دریافت کر لیتے کہ کس نے ان کی یہ درگت بنائی ہے؟ جب یہ اتنے بے بس ہیں کہ اپنے سر پر آئی مصیبت کو دفع نہیں کر سکتے تو یہ دوسروں کے کیا کام آسکتے ہیں اور ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟

حضرت ابراہیمؑ کا وار ٹھیک نشانے پر لگا۔ ان لوگوں نے غور کیا تو انھیں حضرت ابراہیمؑ کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوا۔ جب یہ معبود اتنے بے اختیار اور بے بس ہیں کہ منہ سے بھی نہیں بتا سکتے کہ ان پر کیا بیتی ہے؟ تو یہ پرستش کے کیسے مستحق ہو سکتے ہیں؟ لیکن فوراً ان پر جہالت اور ہٹ دھرمی سوار ہو گئی۔ اور وہ بولے: ''تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں'' حضرت ابراہیمؑ اسی جواب کے منتظر تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی جواب تھا بھی نہیں۔ ان سے اعتراف کروا لینے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے ایک دوسرا بھرپور وار کیا: فرمایا:

اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۞ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (الانبیاء:۶۶،۶۷)

پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمھیں کچھ نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟

سورۂ صافات میں ہے کہ انھوں نے اس موقع پر یہ فرمایا:

اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۙ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(الصافات:۹۵-۹۶)

کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اوران چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو۔

اپنی اس تقریر میں حضرت ابراہیمؑ نے قوم کے لوگوں کی عقلوں کو اپیل کیا۔ ان سے فرمایا: تم لوگ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہو، جو کسی کو نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان۔ بلکہ انھیں خود تم نے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے۔ بت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سامنے پڑے ہوئے، اپنی بے بسی کی داستان سنا رہے تھے۔ اس منظر نے قوم کے سربراہوں، پیشواؤں اور عوام سب کی زبانیں گنگ کر دیں۔ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو انھوں نے وہی حربہ اختیار کیا جو ایسے موقعے پر کھسیاہٹ میں اختیار کیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ عمل سربراہان قوم کی نظر میں بغاوت کے مترادف تھا۔ بتوں کو توڑ کر معبودوں کی توہین وتذلیل کی گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے طے کیا کہ اس جرم کی ایسی سخت سزا دی جائے، جو آئندہ دوسروں کے لیے بھی باعث عبرت ہو۔ انھوں نے بالاتفاق فیصلہ کیا:

حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۶۸)

جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی۔ اگر تمھیں کچھ کرنا ہے۔

قرآن میں ایک دوسرے مقام پر ہے کہ ان میں باہم یہ رائے مشورہ ہوا:

اُقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ. (العنکبوت: ۲۴)

قتل کر دو اسے یا جلا ڈالو اس کو۔

بادشاہ سے محاجّہ

قرآن کریم میں بادشاہِ وقت سے حضرت ابراہیمؑ کے مباحثے اور محاجّے کا ایک واقعہ مذکور ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ

وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ (البقرۃ: ۲۵۸)

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا، جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا؟ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ ”میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا: ”زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے“ ابراہیمؑ نے کہا: اچھا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا“ یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا۔ مگر اللہ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا۔

یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟ اس کا کوئی اشارہ قرآن میں موجود نہیں ہے۔ اس زمانے میں بادشاہ خود کو دیوتاؤں کا اوتار قرار دیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے دنیوی معاملات میں فرماں روائی کے مطلق اختیارات اپنے لیے خاص کر رکھے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب توحید کی دعوت پیش کی تو اس کی زد نہ صرف قوم کے معبودوں پر پڑتی تھی بلکہ بادشاہِ وقت کا اقتدار بھی اس کی زد میں آتا تھا۔ چنانچہ ان کی دعوت جب عام ہوئی اور بادشاہِ وقت کو اس کی اطلاع ہوئی تو کسی موقعے پر اس نے آپ کو بلا کر دریافت کیا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قوم کے مذہبی پیشواؤں نے بتوں کو توڑنے کے جرم کی سزا تجویز کی ہو، اس کی تنفیذ کے لیے حضرت ابراہیم کو بادشاہِ وقت کے سامنے پیش کیا گیا ہو اور اس وقت ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی ہو، جیسا کہ تالمود سے معلوم ہوتا ہے۔

بادشاہ نے حضرت ابراہیمؑ سے دریافت کیا ہوگا کہ یہ کیسا دین ہے، جس کی طرف تم لوگوں کو بلا رہے ہو اور یہ کون رب ہے جس پر ایمان لانے کی تم دعوت دیتے ہو؟ اس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: ”میرا رب وہ ہے، جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے“ بادشاہ نے فوراً جواب دیا: زندگی اور موت دینا تو میرے اختیار میں ہے۔ میں جس کو چاہوں قتل کر دوں اور جس کو چاہوں بخش دوں۔ روایات میں ہے کہ اس نے ایسا کر کے بھی دکھایا۔ دو آدمیوں کو بلایا ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس نے بطور تمثیل کہا: میں چار آدمیوں کو ایک گھر میں بھوکا پیاسا قید کر دیتا ہوں، یہاں تک کہ وہ بھوک پیاس سے ہلاکت کے قریب پہنچ جاتے ہیں تو ان میں سے دو کو کھانا پانی فراہم کرنے کا حکم دیتا ہوں، جس سے وہ جی

جاتے ہیں اور دو کو ویسے ہی رہنے دیتا ہوں جس سے وہ مر جاتے ہیں"۔ (۱)

موت و حیات کی اصل حقیقت، اس سے مختلف تھی، جس معنی میں اسے بادشاہ نے مراد لیا تھا۔ اس نے تو اپنے جواب کے ذریعے مغالطہ دینے کی کوشش کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے لیے ممکن تھا کہ وہ موت و حیات کے فلسفہ پر روشنی ڈالتے اور دونوں باتوں میں فرق واضح کر دیتے۔ لیکن اس طرح بادشاہ کو مزید حجت طرازی کا موقع مل جاتا اور وہ عوام کے سامنے اصل معاملے کو الجھا دیتا۔ اس لیے انھوں نے اس بحث میں پڑنے کے بجائے ایک دوسرا جواب دیا۔ انھوں نے فرمایا: میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ تم اسے مغرب سے نکال کر دکھاؤ"

حضرت ابراہیمؑ کی دوسری دلیل پہلی دلیل کا تتمہ تھی یا اس سے یکسر غیر متعلق تھی؟ اس سلسلے میں مفسرین کے دونوں طرح کے اقوال ہیں۔ بہر حال جو صورت بھی فرض کر لیں، حضرت ابراہیمؑ کا یہ وار ایسا بھرپور تھا کہ وہ ششدر رہ گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس کے لیے جواب کی تین صورتیں ہی ممکن تھیں: یا تو وہ یہ کہتا کہ نظام شمسی میرا ہی قائم کیا ہوا ہے۔ مگر اس نے یہ جواب اس لیے نہیں دیا کہ وہ خود اس بات کا قائل نہیں تھا۔ دوسری صورت میں وہ یہ کہتا کہ سورج کسی کا پابند نہیں ہے بلکہ وہ خود دیوتا ہے۔ اگر وہ یہ کہتا تو حضرت ابراہیمؑ کا وہی اعتراض پھر سامنے آ جاتا جو انھوں نے عوام کے سامنے پیش کیا تھا کہ اگر یہ دیوتا ہے تو اس میں تغیرات کیوں ہوتے ہیں؟ تیسری صورت یہ تھی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے چیلنج کو قبول کر لیتا اور سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا دیتا۔ چونکہ نمرود کے لیے ان میں سے کوئی صورت ممکن نہ تھی اس لیے لاجواب ہونے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

تالمود میں ہے کہ اس کے بعد بادشاہ نے حضرت ابراہیمؑ کو قید کر کے بغاوت کے جرم میں انہیں زندہ جلائے جانے کا فیصلہ صادر کر دیا۔

معجزہ

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کے لیے ایک بہت بڑا احاطہ تیار کیا گیا۔ اس میں بڑی مقدار میں لکڑیاں اور آتش گیر مادے جمع کیے گئے۔ ایک مدت تک آگ بھڑکائی گئی۔ یہاں

(۱) روایات کی تفصیل کے لیے دیکھیے۔ تفسیر طبری۔ ۵/۴۳۳-۴۳۷ اور دیگر تفسیریں

تک کہ جب اس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تو اس میں حضرت ابراہیمؑ کو ڈال دیا گیا۔ اسرائیلی اور تاریخی روایات میں آگ جلائے جانے اور اس میں حضرت ابراہیمؑ کے ڈالے جانے کے سلسلے میں تفصیلات مذکور ہیں۔ اگرچہ ان کا کوئی استناد نہیں ہے لیکن یہ بہر حال واضح ہے کہ سربراہان قوم نے عبرت ناک سزا دینے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی ہوگی۔ قرآن میں ہے:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝ (الصافات۔۹۷)

انھوں نے کہا کہ "اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو"

"بنیان" کے لفظ سے اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے آگ دہکانے کے لیے خصوصی انتظامات کیے تھے اور ایک مخصوص جگہ اس کا الاؤ تیار کیا تھا۔ قرآن میں "جحیم" کا لفظ عام طور پر 'جہنم کی آگ' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ صرف اسی جگہ اس کا اطلاق دنیا کی آگ کے لیے ہے۔ اس کے ذریعے اس آگ کی شدت اور ہولناکی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

اس وقت معجزہ ظاہر ہوا۔ حضرت ابراہیمؑ کے خلاف تدبیریں تیار کرنے والے ناکام ہو گئے۔ آگ ان کے لیے گل گلزار بن گئی اور وہ اس کے ضرر سے محفوظ رہے۔ قرآن میں ہے:

قُلْنَا يٰنَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيمَ ۝ وَاَرَادُوا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِينَ ۝ (الانبیاء:۶۹۔۷۰)

ہم نے کہا "اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر"۔ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کا واقعہ تورات میں مذکور نہیں۔ بلکہ وہ ان کی ماقبل ہجرت زندگی کے ذکر سے خاموش ہے۔ البتہ یہ واقعہ سفر بیاشار اور تکوین ربا (نسخہ سبعیہ) میں موجود ہے۔ (۱) اسی طرح یہ واقعہ انجیل برناباس میں بھی مذکور ہے۔ البتہ اس کی کچھ تفصیلات قرآن سے مختلف ہیں۔

اعلانِ براءت

یہ معجزہ دیکھ کر بھی قوم کی اکثریت حضرت ابراہیمؑ پر ایمان نہ لائی۔ قرآن میں اگرچہ

(۱) دیکھیے مقالہ داستانِ خلیل۔ ابوالجلال ندوی۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۱ء

صرف حضرت لوط کے ایمان لانے کی صراحت ہے (العنکبوت:۲۶) تاہم کچھ اور لوگوں کے ایمان لانے کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی قوم سے قطع تعلق کر لیا اور شرک سے براءت کا اعلان کر دیا۔ قرآن نے ان کے اس رویّے کو ''اسوۂ حسنہ'' سے تعبیر کیا ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (الممتحنة:۴)

تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا ''ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

قوم پر حجت تمام ہو چکی تھی۔ ان تک دین کی دعوت پہنچائی جا چکی تھی۔ سعید روحیں ایمان کی نعمت سے بہرہ ور ہو گئی تھیں اور بد بخت لوگ اپنی سرکشی میں انتہا تک جا پہنچے تھے۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے اذن الٰہی سے وہاں سے ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ البتہ انھوں نے چاہا کہ ہجرت سے قبل آخری مرتبہ اپنی قوم کو جہنم کے عذاب سے ڈرائیں۔ انھوں نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ (العنکبوت:۲۵)

تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے اور آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔

قومِ ابراہیمؑ کا انجام

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ جب کوئی قوم اپنے نبی کی دعوت قبول نہیں کرتی اور اس پر حجت تمام ہو جاتی ہے تو نبی ایمان لانے والوں کے ساتھ وہاں سے ہجرت کر جاتا ہے۔ پھر اس قوم کو سماوی یا ارضی آفات سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت کے بعد ان کی قوم پر کیا عذاب آیا، اس کی تفصیل اگرچہ قرآن میں موجود نہیں ہے، لیکن قوم ابراہیمؑ کا شمار بھی معذب قوموں میں کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور اس پر کوئی نہ کوئی عذاب آیا ہوگا۔ آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۝ وَقَوْمُ اِبْرَاهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۝ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝ (الحج: ۴۲-۴۵)

اے نبی وہ (یعنی کفار) تمہیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیمؑ اور قوم لوط اور اہل مدین بھی جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰ بھی جھٹلائے جا چکے ہیں۔ ان سب منکرین حق کو میں نے پہلے مہلت دی، پھر پکڑ لیا۔ اب دیکھ لو کہ میری عقوبت کیسی تھی؟ کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں۔ کتنے ہی کنویں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔

سورۂ توبہ آیت ۷۰ میں بھی چند معذب قوموں کا تذکرہ ہے۔ ان میں قوم ابراہیمؑ بھی شامل ہے۔

تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں قوم ابراہیمؑ کی تباہی اور بادشاہِ وقت (نمرود) کی ہلاکت کے سلسلے میں جو واقعات منقول ہیں، ان میں بہت سی بے سروپا باتیں پائی جاتی ہیں۔ البتہ تاریخ سے اتنی بات ثابت ہے کہ 'ار' کا علاقہ متعدد مرتبہ تباہ و برباد ہوا ہے۔ مختلف حکومتوں کے درمیان خوں ریز جھڑپیں ہوتی رہی ہیں۔ پڑوس کی بعض حکومتوں نے 'ار' میں قائم حکومت کا

خاتمہ کر کے وہاں تباہی مچائی ہے۔[1] ممکن ہے اسی طرح کی کوئی تباہی حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت کے بعد کے زمانے میں بھی ہوئی ہو۔

اثری تحقیقات کے نتیجے میں بابل میں زیر زمین جو عمارتیں ملی ہیں، وہ سیاہ اور جلی ہوئی حالت میں ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ کلدہ اور اشور میں کسی زمانے میں بڑے پیمانے پر آگ لگی ہوگی۔ کیا عجب کہ جن لوگوں نے اللہ کے نبی کو آگ میں زندہ جلانے کا منصوبہ بنایا تھا وہ خود آگ کے عذاب میں مبتلا ہو گئے ہوں۔[2]

---

(۱) تفہیم القرآن۔ ۱/۵۵۵

(۲) ماہنامہ برہان دہلی، جلد ۱۴، شمارہ ۵، مئی ۱۹۴۵ء، ص ۲۸۶، مقالہ ''ہلال خصیب اور وادیٔ سندھ'' از خواجہ عبدالرشید

ہجرت

قوم کی ہدایت سے مایوس ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے وطن سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کی یہ ہجرت کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں بلکہ سراسر حکم الٰہی کے تابع تھی۔ اس کا اظہار آپ نے یوں فرمایا:

اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (العنکبوت۔۲۶)

میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ وہ زبردست ہے اور حکیم ہے۔

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝ (الصافات:۹۹)

"میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں۔ وہی میری رہنمائی کرے گا۔

"الی ربی" (اپنے رب کی طرف) سے دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت محض اللہ کی رضا کی خاطر اور اس کی راہ میں تھی۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ دوسری یہ کہ ہجرت کرتے وقت انھیں منزل کا پتا نہ تھا۔ وہ محض اللہ کے بھروسے پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اور انہیں پورا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ضرور ان کی صحیح رہنمائی فرمائے گا۔ (۱)

حضرت ابراہیمؑ نے شمال مغرب کی جانب سفر شروع کیا۔ اس سفر میں آپ کی بیوی سارہ اور بھتیجے لوط ساتھ تھے۔ ارشاد باری ہے۔

وَنَجَّیْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ ۝

(الانبیاء: ۷۱)

اور ہم اسے اور لوط کو بچا کر اس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔

(۱) تفسیر قرطبی ۱۳/۳۴۰، کشاف ۳/۲۰۴، تفسیر کبیر ۶/۵۲۰

قرآن میں جس سرزمین کے لیے ''الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْهَا'' کا وصف بیان ہوا ہے[1] اس سے مراد کنعان (فلسطین و شام) ہے۔

کنعان کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے میں ایک علاقہ 'حران' کا پڑتا تھا۔ یہ قافلوں کی گزرگاہ تھی، جہاں وہ کنعان سے آتے اور وہاں جاتے ہوئے ٹھہرتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے وہاں چند دن قیام کیا۔

اس ہجرت کا تذکرہ بائبل میں بھی ہے لیکن قرآن کے برخلاف اس میں یہ بھی ہے کہ اس سفر میں حضرت ابراہیمؑ کا باپ (تارح) بھی ساتھ تھا۔ حران میں ان لوگوں نے چند دن قیام کیا۔ وہیں تارح کا انتقال ہوا۔[2]

کنعان کی طرف

حران میں چند ایام قیام کرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے کنعان کا قصد کیا، جہاں ہجرت کرنے کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا۔ بائبل میں ہے کہ اس حکم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نسل کی کثرت اور برکت کی خوش خبری دی تھی:

> ''اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔ سو تو باعث برکت ہوا۔ جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے.... سو ابرام خداوند کے کہنے کے مطابق چل پڑا اور لوط اس کے ساتھ گیا... اور وہ ملک کنعان کو روانہ ہوئے اور ملک کنعان میں آئے۔''[3]

سفر مصر

کنعان میں کچھ عرصہ قیام کے بعد حضرت ابراہیمؑ مصر تشریف لے گئے۔ قرآن سے اس سفر اور اس کے اسباب پر کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ بائبل کے مطابق اس زمانے میں کنعان میں سخت قحط پڑا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ مصر چلے گئے تھے۔ سفر مصر کے دوران

(۱) دیکھئے آیات:۔ الاعراف:۱۳۷، الأسراء:۱، الانبیاء:۸۱، سبا:۱۸

(۲) کتاب پیدائش باب ۱۱: ۳۱-۳۲ (۳) کتاب پیدائش باب ۱۲: ۱-۵

حضرت ابراہیمؑ سے ایک واقعہ منسوب کیا گیا ہے۔ اصلاً یہ واقعہ بائبل میں مذکور ہے اور غالباً وہیں سے کتب احادیث میں در آیا ہے۔ بائبل میں ہے:

"اور ایسا ہوا کہ جب وہ مصر میں داخل ہونے کو تھا تو اس نے اپنی بیوی ساری سے کہا کہ دیکھ میں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں خوبصورت عورت ہے اور یوں ہوگا کہ مصری تجھے دیکھ کر کہیں گے کہ یہ اس کی بیوی ہے، سو وہ مجھے تو مار ڈالیں گے مگر تجھے زندہ رکھ لیں گے۔ سو تو یہ کہہ دینا کہ میں اس کی بہن ہوں تاکہ تیرے سبب سے میری خیر ہو اور میری جان تیری بدولت بچی رہے۔ اور یوں ہوا کہ جب ابرام مصر میں آیا تو مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے۔ اور فرعون کے امراء نے اسے دیکھ کر فرعون کے حضور میں اس کی تعریف کی اور وہ عورت فرعون کے گھر میں پہنچائی گئی۔ اور اس نے اس کی خاطر ابرام پر احسان کیا اور بھیڑ بکریاں اور گائے بیل اور گدھے اور غلام اور لونڈیاں اور گدھیاں اور اونٹ اس کے پاس ہو گئے۔ پر خداوند نے فرعون اور اس کے خاندان پر ابرام کی بیوی ساری کے سبب سے بڑی بڑی بلائیں نازل کیں۔ تب فرعون نے ابرام کو بلا کر کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ تو نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ یہ تیری بیوی ہے؟ تو نے یہ کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے؟ اسی لیے میں نے اسے لیا کہ وہ میری بیوی بنے۔ سو دیکھ تیری بیوی حاضر ہے۔ اس کو لے اور چلا جا۔ اور فرعون نے اس کے حق اپنے آدمیوں کو ہدایت کی اور انھوں نے اسے اور اس کی بیوی کو اس کے سب مال کے ساتھ روانہ کر دیا۔" (۱)

اقتباس بالا میں فرعون کے ذریعے دیے گئے مال و اسباب میں اجمالی طور پر 'لونڈیوں' کا تذکرہ ہے۔ آگے ایک جگہ ہے کہ "ساری کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا (باب ۱۶:۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تحائف میں ہاجرہ بھی تھیں۔

اس واقعے کو محدثین، مفسرین اور مورخین نے بھی نقل کیا ہے۔ کسی نے اجمالاً تو کسی نے تفصیلاً۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں متعدد مقامات پر اسے بیان کیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"ایک مرتبہ حضرت ابراہیمؑ سارہ کے ساتھ ایک ایسے علاقے سے گزرے، جہاں کا بادشاہ بڑا ظالم تھا۔ اسے بتایا گیا کہ یہاں ایک ایسا شخص آیا ہوا ہے، جس کے ساتھ

(۱) کتاب پیدائش باب ۱۲: ۱۰

ایک انتہائی خوب صورت عورت ہے۔ اس نے انہیں بلا بھیجا اور دریافت کیا کہ تمھارے ساتھ یہ کون ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا: بہن۔ پھر واپس آکر سارہ کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس وقت روئے زمین پر میرے اور تمہارے علاوہ کوئی مومن نہیں ہے۔ یہاں کے بادشاہ نے مجھ سے تمہارے بارے میں دریافت کیا تو میں نے کہہ دیا کہ تم میری بہن ہو۔ دیکھو مجھے مت جھٹلانا۔ بادشاہ نے سارہ کو بلا بھیجا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں اور اس نے دست درازی کرنی چاہی تو اس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ اس نے کہا میرے لیے اللہ سے دعا کر دو۔ میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ انھوں نے دعا کی اور اس کا ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔ اس نے دوبارہ بری نیت سے ہاتھ بڑھایا اور اس کا ہاتھ پھر شل ہو گیا۔ اس نے پھر درخواست کی کہ اللہ سے میرے لیے دعا کر دو، میں کچھ نقصان نہ پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہ نے دعا کی اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ اس نے اپنے دربان کو بلا کر کہا کہ تم میرے پاس کسی انسان کو نہیں بلکہ شیطان کو لے آئے ہو۔ اس نے خدمت کے لیے ہاجرہ دی۔ سارہ واپس آئیں تو حضرت ابراہیمؑ نماز میں مشغول تھے۔ انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ سارہ نے کہا: اللہ نے فاجر کی سازش کو ناکام بنا دیا اور مجھے خدمت کے لیے ہاجرہ دی''[1]

محدثین نے اس مضمون کی روایات کو موقوفاً اور مرفوعاً دونوں طریقوں سے روایت کیا ہے۔ عموماً ان کا ذکر ''ثلاث کذبات'' (تین جھوٹ) کی بحث میں آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زندگی میں تین مواقع پر جھوٹ بولا تھا۔ ان میں سے ایک مذکورہ بالا موقع تھا، جب انھوں نے فرعون مصر کے سامنے اپنی بیوی کو بہن کہہ دیا تھا، دوسرا جھوٹ یہ تھا کہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے بستی والوں کے بلانے پر انھوں نے کہہ دیا تھا کہ میں بیمار ہوں (انی سقیم) اور جھوٹ کا تیسرا موقع وہ تھا، جب قوم کے دریافت کرنے پر کہ کیا معبد کے بت انھوں نے توڑے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا تھا کہ یہ حرکت اس بڑے بت کی ہے جو صحیح و سالم کھڑا ہے۔

مفسرین نے بہت وضاحت سے لکھا ہے کہ موخر الذکر دونوں مواقع پر حضرت ابراہیمؑ کے جوابات کو کسی طرح جھوٹ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان سے تو بتوں کی تحقیر اور استہزا مقصود ہے اور اس سے حضرت ابراہیمؑ کے مخصوص اسلوب دعوت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

زیر بحث واقعہ بھی متعدد داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنا پر معتبر نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً

(۱) صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قولہ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا

روایت میں حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول مذکور ہے کہ "اس وقت روئے زمین پر میرے اور تمہارے علاوہ کوئی مومن نہیں ہے" حالانکہ اس سے قبل حضرت لوط ایمان لا چکے تھے۔ بائبل اور مذکورہ روایت کا موازنہ کرنے سے دونوں کے مضامین میں بڑی حد تک یکسانی ملتی ہے۔ اس سے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ ہوسکتا ہے کتب احادیث میں مذکور اس روایت کا ماخذ کوئی اسرائیلی روایت ہو۔

بائبل میں مذکور واقعے میں متعدد نقائص پائے جاتے ہیں۔ کسی شخص کے اپنے رفیق سفر خاتون کو بہن کہنے سے، اس پر تعدی کے امکانات، اسے بیوی کہنے کے مقابلے میں زیادہ بڑھ جاتے تھے۔ پھر اس سے حضرت ابراہیمؑ کی تصویر ایک ایسے شخص کی ابھر کر سامنے آتی، جس نے محض اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولا اور بیوی کو بھی جھوٹ بولنے پر آمادہ کیا۔ دوسری جانب بعض قدیم تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مصر پر جو خاندان حکمران تھا وہ 'ہیکسوس' کہلاتا تھا۔ یہ لوگ امم سامیہ میں سے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ بھی سامی النسل تھے۔ اس لیے اس بات کا امکان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے تعارف ہونے پر اس نے ان کا استقبال کیا ہو۔ ان کی خاطر مدارات کی ہو اور رخصت کرتے وقت غلام، لونڈیاں، چوپائے اور مال و اسباب ساتھ کر دیا ہو۔ بہر حال اتنی بات تو تحقیق شدہ ہے کہ سفر مصر سے واپسی پر فرعون نے ہاجرہ کو آپ کے ساتھ کر دیا تھا۔

کیا ہاجرہ لونڈی تھیں؟

حضرت ہاجرہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ فرعون کی لونڈی تھیں۔ حضرت سارہ کی کرامت دیکھ کر اس نے جہاں دوسرے تحفے تحائف انھیں دیے تھے، وہیں ہاجرہ کو بھی ساتھ کر دیا تھا۔ بائبل میں جہاں حضرت ہاجرہ کا ذکر ہے، وہاں ان کے لیے بار بار لونڈی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً باب ۱۶ میں جو سولہ آیتوں پر مشتمل ہے ان کے لیے چھے مرتبہ لونڈی اور سارہ کے لیے تین مرتبہ 'بی بی' کا لفظ آیا ہے۔ دوسرے ابواب میں بھی ہاجرہ کو لونڈی اور بنی اسماعیل کو لونڈی کی اولاد کہا گیا ہے۔ مثلاً دیکھیے کتاب پیدائش باب ۲۱: ۱۰ (دو مرتبہ) ۱۲، ۱۳ اور باب ۲۵: ۱۲، کتاب یسعیاہ باب ۵۴: ۱ میں بنی اسماعیل کو 'بے کس چھوڑی ہوئی کی اولاد' کہا گیا ہے۔

اس بات کو یہود کی طرف سے اتنے زور شور سے پیش کیا گیا کہ علمائے اسلام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اسرائیلیات کے اثرات کی وجہ سے ان کے درمیان بھی یہ بات

مانی جانے لگی کہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں۔ مثال کے طور پر امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں 'سارہ' فرعون اور ہاجرہ، کے واقعے کو جن ابواب میں ذکر کیا ہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

كتاب البيوع: باب شراء المملوك من الحربي وهبته وعتقه (حربی سے مملوک (لونڈی یا غلام) خریدنے اور اس کے ہبہ کرنے اور آزاد کرنے کا بیان) **كتاب النكاح: باب اتخاذ السراري و ثواب من اعتق جارية ثم تزوّجها** (لونڈی رکھنے کا بیان اور لونڈی کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرنے کے ثواب کا بیان)

جب کہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ کے بارے میں بعض ایسی شہادتیں ہیں، جن سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ لونڈی نہیں بلکہ آزاد خاتون تھیں:[۱]

ا۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بعد کے زمانے میں لونڈی کو میراث میں حصہ نہیں ملتا تھا۔ اسی طرح اس کی اولاد کو بھی میراث میں شریک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ صرف انھیں چیزوں کے مستحق سمجھے جاتے تھے جو ان کا باپ (یعنی ان کی ماں کا آقا) انھیں اپنی زندگی میں دے دے۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے قطورہ کے لڑکوں کو اپنی زندگی میں ہی کچھ دے دلا کر مشرق کی طرف بھیج دیا تھا۔[۲]

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ سارہ نے حضرت ابراہیمؑ کو ہاجرہ اور اسماعیل کو نکال دینے پر اس لیے آمادہ کیا تھا کہ انھیں خوف تھا کہ کہیں اسماعیلؑ اسحاقؑ کے ساتھ میراث میں شریک نہ ہو جائیں:

> ''تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ میراث میں وارث نہ ہوگا''۔[۳]

---

(۱) اس موضوع پہ مولانا عنایت رسول چریاکوٹی نے ایک رسالہ ''النصوص الباہرۃ فی حریۃ ہاجرۃ'' سپرد قلم فرمایا تھا۔ جو مولوی چراغ علی کے رسالہ ''النصوص الظاہرۃ فی حریۃ ہاجرۃ'' کے ساتھ ''حضرت ہاجرہ'' نامی کتاب کی صورت میں اردو بازار اسٹیم پریس امرتسر سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ میں مولانا چریاکوٹی نے حضرت ہاجرہ کے آزاد ہونے کے اثبات میں بائبل سے متعدد دلیلیں دی ہیں۔ بعد کے تمام لوگوں نے اس موضوع پر انھی سے استفادہ کیا ہے۔

(۲) کتاب پیدائش، باب ۲۵: ۱-۶

(۳) ایضاً باب ۲۱: ۱۰

اگر حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں تو اسماعیلؑ کے میراث میں شریک ہونے کا خوف کیوں تھا؟

(۲) اگر ہم لفظ 'لونڈی' کو یہود کا اضافہ نہ مانیں تب بھی خود بائبل کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ 'لونڈی' کا استعمال مجازاً بیوی کے لیے بھی ہوتا ہے۔ یہود میں رواج تھا کہ باپ اپنی بیٹی کی شادی کے وقت اس کے شوہر سے کچھ پیسے لے لیتا تھا۔ اس طریقے کو 'بیٹی کے بیچنے' سے تعبیر کرتے تھے۔ اس کے باوجود بیٹی لونڈی نہ بنتی تھی بلکہ اس کی حیثیت بیوی کی ہوتی تھی۔ کتاب خروج میں ہے:

> "اور اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کو لونڈی ہونے کے لیے بیچ ڈالے تو وہ غلاموں کی طرح چلی نہ جائے اگر اس کا آقا جس نے اس سے نسبت کی ہے اس سے خوش نہ ہو تو وہ اس کا فدیہ منظور کرے پر اسے یہ اختیار نہ ہوگا کہ اس کو کسی اجنبی قوم کے ہاتھ بیچے کیونکہ اس نے اس سے دغابازی کی" (۱)

یہاں لونڈی سے مراد بیوی ہے۔ مجازاً اس کا اطلاق لونڈی پر کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت داوٗدؑ کی بیوی کے لیے لونڈی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

> "اور جب داوٗد کے خادم کرمل میں ابیحیل کے پاس آئے تو انھوں نے اس سے کہا کہ داوٗد نے ہم کو تیرے پاس بھیجا ہے تاکہ ہم تجھے اس سے بیاہنے کو لے جائیں۔ سو وہ اٹھی اور اوندھے منہ گری اور کہنے لگی کہ دیکھ تیری لونڈی تو نوکر ہے تاکہ اپنے مالک کے خادموں کے پاؤں دھوئے۔"

بعض علمائے یہود نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہاجرہ لونڈی نہیں بلکہ فرعون مصر کی بیٹی تھیں۔ توریت کے مفسر ربی شمومو اسحاق نے کتاب پیدائش باب ۱۶ کی تفسیر میں لکھا ہے:

> "وہ فرعون کی بیٹی تھی۔ جب اس نے کرامات کو دیکھا جو بوجہ سارہ واقع ہوئی تھیں تو کہا کہ میری بیٹی کا اس کے گھر میں خادمہ ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے۔"

قصص یہود کا جو مجموعہ گنز برگ (GINZBERG) نے چار جلدوں میں شائع کیا ہے اس میں ہے: "بادشاہ مصر نے عہد کر لیا کہ وہ ابراہیمؑ کو ہر طرح پر قوت و پرشوکت بنا کر رہے

(۱) کتاب خروج، باب ۲۱: ۷-۸

گا..... چنانچہ اپنی بیٹی تک ہدیہ دے دی۔ سارہ کی تعلیم وتربیت میں رہ کر وہ بھی ویسی ہی باخدا بن گئیں اور ہر طرح ابراہیمؑ کی رفاقت کے قابل"

احادیث میں اس سلسلے میں جو تعبیرات آئی ہیں، ان سے بھی حضرت ہاجرہ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ صحیحین میں ہاجرہ کے لیے جو الفاظ آئے ہیں، وہ یہ ہیں:

اخدم وليدةً، اخدم هاجرة، اخدمني هاجر، اعطوها هاجر، اخدم خادما.

یہ الفاظ لونڈی کے لیے خاص نہیں ہیں۔ ولیدۃ کا اطلاق ہر لڑکی پر ہوتا ہے۔ اسی طرح خادم (خدمت گزار) کے لیے بھی غلام یا لونڈی ہونا ضروری نہیں۔ اور اَخدَمَ (خدمت کے لیے دینا) بھی اس معنی میں صریح نہیں ہے کہ جس کو خدمت کے لیے دیا جائے وہ غلام یا لونڈی ہو۔ اس لیے ان الفاظ سے یہ استنباط کرنا کہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں، صحیح نہیں ہوگا۔

حضرت اسماعیلؑ کی ولادت

حضرت ابراہیمؑ اس وقت تک صاحبِ اولاد نہ تھے۔ ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش ان کی کوئی اولاد ہوتی، جو ان کے کام میں ان کا سہارا بنتی۔ انھوں نے دعا کی شکل میں اس خواہش کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے شرف قبول بخشا۔

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ o فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ o

(الصافات: ۱۰۰، ۱۰۱)

اے پروردگار! مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو (اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔

اس دعا اور اس کی قبولیت کا ذکر بائبل میں بھی تفصیل سے ہے:

"ابرام نے کہا: اے خداوند خدا تو مجھے کیا دے گا؟ کیونکہ میں بے اولاد جاتا ہوں.... تب خداوند کا کلام اس پر نازل ہوا اور اس نے فرمایا: وہ جو تیرے صلب سے پیدا ہوگا وہی تیرا وارث ہوگا" اور وہ اس کو باہر لے گیا اور کہا اب آسمان کی طرف نگاہ کر اور اگر تو ستاروں کو گن سکتا ہے، تو گن اور اس سے کہا کہ تیری اولاد ایسی ہی ہوگی" (۱)

(۱) کتاب پیدائش باب ۱۵: ۲-۵

اس بشارت الٰہی کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا تو ان سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر بائبل کے مطابق چھیاسی سال تھی۔ (۱)

آزمائش

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو بڑھاپے میں اولاد سے نوازا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب حضرت اسماعیلؑ کچھ بڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو آزمایا۔ اس نے حکم دیا کہ اپنی اولاد کو اس کی ماں سمیت بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ آؤ۔ یہ بہت بڑی آزمائش تھی، لیکن ابراہیمؑ نے حکم الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ بالآخر جب وہ اس آزمائش میں پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے اس بیابان میں زندگی کا سامان کر دیا۔ اس واقعے کی طرف قرآن حکیم میں یوں اشارہ ملتا ہے:

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ. (ابراھیم:۳۷)

پروردگار! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصہ کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔

اس کے برعکس بائبل میں ہے کہ حضرت سارہ نے حضرت ابراہیمؑ پر دباؤ ڈال کر ہاجرہ اور اسماعیل کو گھر سے نکلوا دیا تھا۔ اس کے مطابق ننانوے برس کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک دوسرے بیٹے کی بشارت سنائی اور اگلے سال حضرت سارہ سے اسحاقؑ کی ولادت ہوئی۔ صاحب اولاد ہونے کے بعد انھوں نے ہاجرہ اور اسماعیل کو بے گھر کر دیا:

اور وہ لڑکا (اسحاقؑ) بڑھا اور اس کا دودھ چھڑایا گیا اور اضحاق کے دودھ چھڑانے کے دن ابرہام نے بڑی ضیافت کی اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا، ٹھٹھے مارتا ہے، تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے، کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔

(۱) کتاب پیدائش باب ۱۵: ۲-۵

بائبل کے اس بیان سے خود حضرت سارہ کی سیرت داغ دار ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اسحاقؑ کی پیدائش کے بعد پیش آیا۔ حالانکہ ـــ جیسا کہ آپ آگے پڑھیں گے ـــ بائبل ہی کے دوسرے بیانات اس کے برعکس ہیں۔

بے آب و گیاہ وادی میں

حضرت اسماعیلؑ کے اپنی ماں کے ساتھ بے آب و گیاہ وادی میں آباد کیے جانے کا واقعہ حدیث میں تفصیل سے مذکور ہے۔ وہ اگرچہ حضرت ابن عباسؓ سے موقوفاً مروی ہے لیکن اس کے بعض اجزاء ابن عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔

> "حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیل کو جبکہ وہ ابھی دودھ پی رہے تھے، لے کر آئے اور ان کو ایک درخت کے نیچے اس جگہ چھوڑ دیا جہاں بعد میں زمزم نکلا، مکے کی سنسان وادی میں اس وقت کوئی ایک انسان بھی موجود نہ تھا اور نہ کہیں پانی پایا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے چمڑے کا ایک تھیلا جس میں کھجوریں تھیں اور پانی کا مشکیزہ، ہاجرہ کو دیا اور واپس روانہ ہوئے۔ ہاجرہ ان کے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں: ابراہیمؑ: کہاں جا رہے ہو؟ اور ہمیں اس سنسان بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑے جا رہے ہو؟ یہ بات حضرت ہاجرہ نے کئی مرتبہ کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا: کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ جواب میں انھوں نے بس اتنا فرمایا کہ ہاں۔ اس پر وہ بولیں: اگر یہ بات ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا۔ اور پلٹ کر بیٹے کے پاس آبیٹھیں۔ حضرت ابراہیمؑ جب پہاڑ کی اوٹ میں پہنچے جہاں سے یہ ماں بیٹے نظر نہ آتے تھے تو بیت اللہ کی طرف (اس جگہ کی طرف جہاں آخر کار انھیں بیت اللہ تعمیر کرنا تھا) رخ کیا اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ ٱلۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجۡعَلۡ أَفۡـِٔدَةٗ مِّنَ ٱلنَّاسِ تَهۡوِيٓ إِلَيۡهِمۡ وَٱرۡزُقۡهُم مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُونَ ○ (ابراھیم:۳۷) (پروردگار میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے، پروردگار! یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا

مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے۔ شاید کہ یہ شکر گزار بنیں) ادھر اسماعیلؑ کی والدہ ان کو دودھ پلاتی رہیں اور مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں۔ جب پانی ختم ہو گیا تو انھیں اور بچے کو پیاس لگنی شروع ہوئی۔ وہ بچے کو تڑپتا ہوا دیکھتی رہیں۔ آخر بچے کی حالت ان سے دیکھی نہ گئی اور وادی کی طرف یہ دیکھنے کے لیے چل پڑیں کہ کوئی آدمی نظر آئے، مگر کوئی نظر نہ آیا۔ پھر صفا کی پہاڑی سے اتر کر وادی کے بیچ میں آئیں اور اپنا بازو اٹھا کر اسی طرح دوڑیں جیسے کوئی مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ پھر مروہ کی پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں کہ کوئی آدمی نظر آتا ہے یا نہیں، مگر کوئی نظر نہ آیا۔ یہ فعل انھوں نے سات مرتبہ (صفا اور مروہ کے درمیان) کیا۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا: ''اس وجہ سے لوگ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔''

آخری مرتبہ جب وہ پہاڑی پر چڑھیں تو انھوں نے ایک آواز سنی۔ اپنے آپ سے کہنے لگیں: چپ رہ (شور مچانا بند کر) اور غور سے سننے لگیں۔ آواز پھر آئی۔ انھوں نے کہا: اے شخص تو نے اپنی آواز مجھے سنا دی کیا تیرے پاس میری فریاد رسی کے لیے کچھ ہے؟ یکا یک انھوں نے زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ دیکھا (ابراہیم بن نافع اور ابن جریج کی روایت میں ہے کہ جبرئیل کو دیکھا) کہ وہ ایڑی یا بازو سے زمین کھود رہے ہیں۔ یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ لپ بھر بھر کر وہ پانی مشکیزہ میں بھرنے لگیں اور جیسے جیسے وہ پانی بھرتی گئیں پانی ابل ابل کر اوپر آتا رہا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ اسماعیل کی ماں پہ رحمت فرمائے۔ اگر وہ زمزم کو اسی حالت میں چھوڑ دیتیں (چاروں طرف مٹی ڈال کر اسے گھیر نہ لیتیں) تو زمزم بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔'' اس طرح حضرت ہاجرہ پانی پینے لگیں اور اپنے بچے کو دودھ پلانے لگیں۔ فرشتے نے ان سے کہا: ضائع ہونے کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے، جسے یہ بچہ اور اس کا باپ دونوں تعمیر کریں گے اور اللہ اس گھر کے لوگوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ (1)

بائبل میں یہ واقعہ یوں مذکور ہے:

''تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا، بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی۔ اور جب مشک کا پانی

(1) صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قولہ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا

ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے مقابل ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں۔ سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر، کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہوا ہے اس کی آواز سن لی ہے۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال، کیوں کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک سے پانی کو بھر لیا اور لڑکے کو پلایا۔" (۱)

اوپر بائبل ہی کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر چھیاسی سال اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے وقت سو سال تھی۔ اور حضرت اسماعیلؑ کو ماں کے ساتھ گھر سے نکالے جانے کا واقعہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے بعد پیش آیا۔ یعنی گھر سے نکلتے وقت ان کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ لیکن یہاں الفاظ "لڑکے کو جھاڑی کے نیچے ڈال دیا" "جہاں لڑکا پڑا ہے" اور "اٹھ اور لڑکے کو اٹھا" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت اسماعیل شیر خوار تھے اور انھیں چلنا بھی نہیں آتا تھا۔ بائبل کے اس صریح تعارض کی بنا پر علمائے اسلام میں سے بعض نے سرے سے ہاجرہ اور اسماعیل کے گھر سے نکالے جانے اور بیابان میں رہنے والے واقعہ کا انکار کیا ہے اور بعض نے اس واقعہ کو مانتے ہوئے اسے اس وقت کا واقعہ قرار دیا ہے، جب اسماعیل چودہ پندرہ سال کے تھے اور ان کی شیر خوارگی کے زمانے کا واقعہ ہونے کی تردید کی ہے۔ (۲)

صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت اسماعیل کو زمانۂ طفولیت ہی میں ان کی ماں سمیت بے آب و گیاہ وادی میں لا بسایا تھا۔ بائبل کی عبارتیں یہود کی تحریفات کی وجہ سے تعارض و تضاد کا شکار ہو گئی ہیں۔ ان کی بنی اسماعیلؑ سے دشمنی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ انھوں نے بنی اسماعیل کو ذلیل کرنے کیلئے ان کی ماں حضرت ہاجرہ

(۱) کتاب پیدائش، باب ۱۲:۱۴-۱۹

(۲) تفصیل کے لیے دیکھئے راقم کا مقالہ "مناسک حج کی تاریخ" شائع شدہ ماہنامہ حیات نو اعظم گڑھ جلد ۲، شمارہ ۵-۷، مئی تا جولائی ۱۹۸۷ء

کو حضرت سارہ کی باندی اور خود بنی اسماعیل کو لونڈی کی اولاد کہنا شروع کر دیا۔ قربانی کے شرف سے بنی اسماعیل کو محروم کرنے اور خود اس کا مستحق بننے کیلئے تورات کے نص میں تحریف کر کے اسماعیل کی جگہ اسحاقؑ داخل کر دیا۔ اور چونکہ خود تورات سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ قربانی کا واقعہ اسحاقؑ کی پیدائش سے پہلے پیش آیا اس لئے انھوں نے اپنی تحریف کو چھپانے اور اسکو صحیح ثابت کرنے کیلئے اپنی طرف سے اضافے کئے اور وہ قصہ گڑھا جو حضرت اسحاقؑ کے پیدا ہونے، ان کے ساتھ حضرت اسماعیل کے گستاخی کرنے، اور حضرت سارہ کے حضرت ابراہیمؑ سے کہہ کر ہاجرہ اور اسماعیل کو گھر سے نکلوا دینے کی صورت میں ہمیں تورات میں ملتا ہے۔ یہود کے اسی اضافہ کی وجہ سے تورات کی عبارتیں تضاد کا شکار ہو گئیں۔ ورنہ صحیح یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے زمانہ طفولیت ہی میں اسماعیل کو ان کی والدہ کے ساتھ بے آب و گیاہ وادی میں، جہاں بعد میں مکہ آباد ہوا، لا بسایا تھا۔ حضرت سارہ کے کہنے پر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ اور وہاں وہ واقعہ پیش آیا جو ہمیں صحیح بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

واقعۂ ذبح

حضرت اسماعیلؑ اپنی ماں کے ساتھ وادی مکہ میں پروان چڑھتے رہے۔ حضرت ابراہیمؑ ان کی خبر گیری کے لیے وقتاً فوقتاً آتے رہتے تھے۔ جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک دوسری آزمائش میں مبتلا کیا۔ انھیں خواب میں دکھایا کہ وہ اپنے بیٹے کو راہ خدا میں قربان کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اسے وحیِ الٰہی سمجھ کر فوراً آمادہ تعمیل ہو گئے۔ انھوں نے اپنے بیٹے سے مشورہ کیا تو اس نے بھی حکم الٰہی کے آگے سر جھکا دیا:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُـؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الصافات: ۱۰۲)

وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا "بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: ابا جان جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔

باپ بیٹے دونوں تسلیم واطاعت کے جذبے سے سرشار ہو کر خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے مضطرب ہو گئے۔ باپ نے بیٹے کو قربان کرنے کے لیے پچھاڑ دیا۔ اور قریب تھا کہ چھری بیٹے کے حلقوم پر چل جائے۔ غیب سے ندا آئی: ابراہیمؑ تم نے خواب کو سچ کر دکھایا اور آزمائش میں کامیاب ہو گئے۔ مقصود کسی کو ذبح کروانا نہیں بلکہ امتحان لینا تھا۔ قرآن نے بہت ایجاز اور اعجاز کے ساتھ اس منظر کو بیان کیا ہے۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ (الصافات:۱۰۳-۱۰۷)

آخر کو جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ "اے ابراہیمؑ تو نے خواب سچ کر دکھایا ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی" اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔

جس جانور کو حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے کے فدیہ کے طور پر قربانی کے لیے پیش کیا گیا، اسے آیت بالا میں "ذبح عظیم" (بڑی قربانی) کہا گیا ہے۔ اس میں کیا عظمت پائی جاتی ہے؟ مولانا مودودیؒ نے اسکی یہ وضاحت کی ہے:

"اسے بڑی قربانی کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ ابراہیمؑ جیسے وفادار بندے کے لیے فرزند ابراہیمؑ جیسے صابر وجاں نثار لڑکے کا فدیہ تھا اور اسے اللہ تعالیٰ نے ایک بے نظیر قربانی کی نیت پوری کرنے کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اسے "بڑی قربانی" قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سنت جاری کر دی کہ اسی تاریخ کو تمام اہل ایمان دنیا بھر میں جانور قربان کریں اور وفاداری وجاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتے رہیں" (۱)

قربانی کی حقیقت

حضرت ابراہیمؑ کو قربانی سے متعلق جو خواب دکھایا گیا تھا، وہ عینی تھا یا تمثیلی؟ عینی میں وہی چیز مقصود ہوتی ہے، جو خواب میں دکھائی دیتی ہے، جب کہ تمثیلی خواب تعبیر کا محتاج ہوتا ہے۔

---

(۱) تفہیم القرآن ۔۴/۲۹۷، مزید دیکھئے تفسیر قرطبی ۱۵/۱۰۷، تدبر قرآن ۵/۴۸۵

بعض علماء کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا خواب تمثیلی تھا اور اس کی تعبیر یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ مگر ان پر یہ تعبیر مخفی رہ گئی اور اس کو عینی خیال کر کے انھوں نے بعینہ اس کی تعمیل کرنی چاہی۔ بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ وہ خواب کی تعبیر سمجھ تو گئے تھے لیکن غلبۂ شوق و اطاعت میں اس حکم الٰہی کی تعمیل اپنی طرف سے بعینہ و بلفظہ کرنے پر آمادہ ہو گئے، تا کہ اس ابتلاء میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پورے اتریں اور اپنی طرف سے بیٹے کی جان کی قربانی کی جگہ اس کی خدمت توحید و تولیت کعبہ کے لیے وقف کر دینے کی تاویل کا سہارا لے کر نفس کی متابعت کے شعبے اور دھوکے سے بھی پاک رہیں۔(۱)

جمہور امت کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا خواب عینی تھا اور وہ اسے عینی سمجھتے ہوئے ہی اس کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے تھے۔ انھیں یہ حکم بطور آزمائش دیا گیا تھا اور وہ اس آزمائش میں پورے اترے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنے ایک مقالے میں اس موضوع پر جمہور کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''قرآن میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کا اشارہ پایا تھا۔ اس کے امتثال میں وہ واقعی اپنے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ جب انھوں نے لختِ جگر کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یا ابراهیمؑ قدصدقت الرویا انا کذلك نجزی المحسنین وان هذا لهو البلاء المبین (الصافات:۱۰۵-۱۰۶) اس قصے کا صاف مفہوم جس کو ہر صاحب فہم آدمی پہلی نظر میں محسوس کر سکتا ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کی آزمائش کرنی چاہی۔ اس لیے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم نہ دیا، بلکہ کنایۃً خواب میں ایسا دکھایا کہ اپنے لختِ جگر کو ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ چونکہ خدا کی محبت پر ہر محبت کو قربان کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ اس لیے وہ محبوبِ حقیقی کے محض اس ذرا سے ڈھکے چھپے اشارے ہی پر بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ یہی اصل قربانی تھی اور جب یہ پوری ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے بیٹے کا خون بہانے سے ان کو روک دیا اور ایک ذبح عظیم کو اس کا فدیہ بنا دیا''۔(۲)

---

(۱) راقم نے اپنے مقالہ ''مناسک حج کی تاریخ'' شائع شدہ ماہنامہ حیات نو اعظم گڑھ مئی تا جولائی ۱۹۸۷ء میں اس نقطۂ نظر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

(۲) تفہیمات ۲/۲۴۹، مقالہ ''تحقیق قربانی پر تنقید'' مولانا مودودی نے سیرت سرورِ عالم ۲/۵۹-۶۰ میں بھی خواب کے حقیقی ہونے کے متعدد دلائل دیے ہیں۔

انھوں نے خواب کو تمثیلی قرار دینے والے بعض لوگوں پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس تاویل میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے "قدصدقت الرویا" فرما کر خود یہ تصدیق فرما دی کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب کی تعبیر صحیح سمجھی تھی۔ فاضل مفسر نے اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے آیت کے ترجمے میں ایک ذرا سی تحریف کر دی۔ لفظی ترجمہ یہ تھا کہ ''تو نے خواب کو سچ کر دکھایا'' انھوں نے اس کا ترجمہ کر دیا ''تو نے تو خواب کو سچ کر دکھایا'' دیکھئے اس چھوٹے سے لفظ ''تو'' نے مفہوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جو تصدیق تھی وہ تعریض بن گئی۔ اس کے بعد اگر "کذلك نجزی المحسنین" کا فقرہ بے معنی ہو گیا تو کچھ پروا نہیں۔ رہا "ان هذا لهو البلاء المبین" تو اس نئی تاویل سے اس کے معنی یہ قرار پائے کہ یہ محض حضرت ابراہیمؑ کے عقل کی آزمائش تھی کہ آیا وہ خواب کا مطلب صحیح سمجھتے بھی ہیں یا نہیں؟ اور افسوس کہ بیچارے اس امتحان میں بری طرح فیل ہوئے....''(۱)

خواب کو تمثیلی قرار دینے والے ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ اسے عینی ماننے سے یہ عمل ان بت پرست قوموں سے مشابہ ہو جاتا ہے، جو اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا دیا کرتی ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں۔ اطاعت اور معصیت اعمال کے ذاتی اوصاف نہیں بلکہ خالق کے حکم یا نہی پر مبنی ہیں۔ اگر ایک شخص کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ خالق نے اسے فلاں کام کرنے کا حکم دیا ہے تو وہ عین اطاعت ہو جاتا ہے۔ جب کہ وہی کام دوسروں کے لیے معصیت ہو گا اگر خالق نے انھیں اس کے نہ کرنے کا حکم دیا ہو۔ قاضی ابو بکر ابن العربی فرماتے ہیں:

''اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا کیوں کر حکم دیا جا سکتا ہے جب کہ یہ معصیت ہے اور معصیت پر حکم جائز نہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ کتاب اللہ پر اعتراض ہے، اس لیے اسے کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جو اسلام کو مانتا ہو، چہ جائیکہ حلال وحرام کے فتوے صادر کرتا ہو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "افعل ماتومر" اس سلسلے میں جس بات سے التباس رفع ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ معاصی اور طاعات افعال کے ذاتی اوصاف نہیں ہیں بلکہ جن کاموں کا حکم ہے انہیں کرنا اطاعت اور جن کاموں سے نہی آئی ہے، انہیں کرنا معصیت ہے۔ ابراہیمؑ کو اپنے بیٹے اسماعیل کی قربانی کا حکم دیا گیا اس لیے وہ فعل ان کے لیے اطاعت اور آزمائش ہو گیا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے

(۱) تفہیمات، حوالہ سابق

فرمایا: ان ھذا لھو البلاء المبین یعنی نفس کو قابو میں رکھتے ہوئے بیٹے کو قربان کر دینے پر آمادہ ہو جانا کھلی آزمائش تھی اور چونکہ ہمیں اپنی اولاد کو قربان کرنے سے روکا گیا ہے اس لیے اگر کوئی ایسا کرے گا تو یہ فعل معصیت ہوگا"۔[1]

ذبیح کون؟

حضرت ابراہیمؑ کو کس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ اس پر بڑی معرکہ آرا بحثیں ہوئی ہیں۔ علمائے یہود اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو اللہ تعالیٰ نے قربان کرنے کا حکم دیا تھا وہ اسحاقؑ ہیں نہ کہ اسماعیلؑ۔ اس معاملے میں ان میں اس حد تک اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے کہ آج تک کسی ایک شخص کی طرف سے بھی اس کے برعکس دوسری رائے سامنے نہیں آئی۔ یہی نہیں بلکہ اس رائے کو ان کی طرف سے اس زور شور سے پیش کیا گیا کہ بعض صحابہ و تابعین اور علمائے سلف نے بھی اسے قبول کرلیا اور حضرت اسحاقؑ کو ذبیح قرار دے دیا۔[2] وہ یہود کی اس سازش اور علمی بددیانتی کو نہ سمجھ سکے جو ان کی فطرت ثانیہ میں داخل تھی۔ حالانکہ خود توریت میں متعدد عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبیح اسحاقؑ ہو ہی نہیں سکتے۔ صرف اسماعیلؑ ہی پر ذبیح کی صفت صادق آتی ہے۔ توریت میں یہ بیان کیا گیا ہے:

"خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا: اے ابرہام۔ اس نے کہا: میں حاضر ہوں۔ تب اس نے کہا تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے، ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا"۔[3]

---

(۱) احکام القرآن، ابن العربی، ۴/ ۱۶۱۹

(۲) حضرت اسحاقؑ کو ذبیح قرار دینے والوں میں صحابہ کرام میں سے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عباس، حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ اور تابعین وغیرہ میں سے قتادہ، عکرمہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، مجاہد، شعبی، مسروق، مکحول، زہری، عطا، مقاتل، سدی، کعب احبار، زید بن اسلم کے نام ملتے ہیں۔ البتہ روایتوں میں ان میں سے بعض کی طرف دونوں قسم کے اقوال ملتے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھئے تفسیر طبری اور تفسیر ابن کثیر، سورۃ صافات) ابن کثیر نے ان اقوال کا جائزہ لیتے ہوئے بدلائل ثابت کیا ہے کہ ذبیح اسماعیل ہیں۔ متاخرین میں مولانا فراہی (رسالہ ذبیح کون؟) اور مولانا مودودی (تفہیم القرآن سورۂ صافات) نے بھی اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور حضرت اسماعیل کا ذبیح ہونا ثابت کیا ہے۔

(۳) کتاب پیدائش باب ۲۲: ۱، ۲

ان آیتوں میں ذبیح کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں اور دونوں حضرت اسحاقؑ پر منطبق نہیں ہوتیں بلکہ صریح طور پر حضرت اسماعیلؑ سے متعلق ہیں۔

ا۔ ''جو تیرا اکلوتا ہے''، خود توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حضرت ابراہیمؑ سے حضرت اسماعیل کی ولادت ہوئی۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر چھیاسی سال کی تھی۔ اس کے چودہ سال بعد حضرت اسحاقؑ کی ولادت ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اکلوتے اسماعیل تھے نہ کہ اسحاقؑ۔

۲۔ ''جسے تو پیار کرتا ہے''، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو سارہ سے ایک بیٹا ہونے کی بشارت دی تو توریت کے مطابق ابراہیمؑ نے فرمایا: ''کاش اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے'' اس سے حضرت اسماعیل سے حضرت ابراہیمؑ کی محبت عیاں ہوتی ہے۔

محض یہ دو صفتیں ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہود نے محض اندھی عصبیت اور نسلی دشمنی میں کتاب الٰہی میں تحریف کی اور اسماعیل کی جگہ اسحاقؑ کے نام کو رکھ کر ذبح کا شرف اپنی نسل میں منتقل کرنے کی ناکام کوشش کی۔

اس سلسلے میں قرآن نے اگرچہ صراحت سے کام نہیں لیا۔ لیکن اس میں بھی ایسے واضح اشارات ملتے ہیں، جن سے حضرت اسماعیل کا ذبیح ہونا معلوم ہوتا ہے۔

سورہ صافات میں ہے: رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ○ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ○ (الصافات ۱۰۰، ۱۰۱) اس کے بعد قربانی کا واقعہ بیان کیا ہے، اس کے بعد ہے: وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ○ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ○ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ○ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ○ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ○ وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ○ (الصافات: ۱۰۷-۱۱۲)

ان آیات میں پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک ''غلام حلیم'' کی بشارت دی ہے، پھر قربانی کا واقعہ بیان کیا ہے اور اس آزمائش میں حضرت ابراہیمؑ کے کامیاب ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور ان پر سلامتی بھیجنے کے بعد اسحاقؑ کی پیدائش کی بشارت دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسحاقؑ کی پیدائش نہ صرف یہ کہ قربانی کے بعد ہوئی، بلکہ اسماعیل کی قربانی کے بعد بطور انعام اور فضل کے ہوئی۔ قرآن کی ایک دوسری آیت سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ ارشاد باری ہے: ''وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ ط وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ط (الانبیاء:۷۲) (ہم نے اس کو عطا کیے اسحاقؑ اور یعقوبؑ فضل مزید کے طور پر) بعض مفسرین نے ''نافلة'' کو صرف یعقوبؑ سے متعلق مانا ہے، لیکن

مولانا فراہی کا خیال ہے کہ اس کا تعلق اسحاقؑ اور یعقوب دونوں سے ہے، اس لیے کہ حضرت اسحاقؑ بغیر کسی دعا اور انتظار کے پیدا ہوئے تھے۔

اس سلسلے میں اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں، لیکن جو روایات ملتی ہیں، وہ بھی حضرت اسماعیل کو ذبیح قرار دیتی ہیں۔ انجیل برناباس میں تو صراحت سے مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس بیٹے کی قربانی کرنی چاہی تھی وہ ان کے اکلوتے بیٹے اسماعیل تھے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"فرشتے جبرئیل نے جواب دیا۔ اٹھ یسوع اور ابرہام کو یاد کر، جو خدا کے حکم کی تعمیل میں اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل کو خدا کے لیے قربان کرنے پر تیار ہو گیا تھا اور جب چھری اس کے بیٹے کو نہ کاٹ سکی تو اس نے میرے کہنے پر ایک بھیڑ کی قربانی دی۔ اسی طرح اے یسوع خدا کے بندے تو بھی کر۔" (۱)

"اور ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیل کو جتنا درست تھا، اس سے زیادہ چاہا، جس پر خدا نے ابرہام کے دل سے یہ غلط محبت ختم کرنے کے لیے حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دے۔" (۲)

حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں جو یہودی علماء تھے۔ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ ذبیح اسحاقؑ ہیں۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ نے صراحت سے ان کی تردید کی اور ان کی کذب بیانی واضح کی۔ ایک مرتبہ کاہنوں، فقیہوں، فریسیوں اور سردار کاہن کی مجلس میں فرمایا:

"خدائے زندہ کی قسم۔ ابرہام کو خدا سے ایسی محبت تھی کہ اس نے نہ صرف جھوٹے بت پاش پاش کر دیے اور اپنے باپ اور ماں کو بھی چھوڑ دیا بلکہ خدا کی فرماں برداری میں اپنے بیٹے کو بھی ذبح کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔

سردار کاہن نے جواب دیا: یہی میں تجھ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تجھے قتل کرنا نہیں چاہتا۔ سو ہمیں بتا ابرہام کا یہ بیٹا کون سا تھا؟

یسوع نے جواب دیا: خدایا تیری حرمت کی غیرت مجھے اکساتی ہے اور میں چپ نہیں رہ سکتا۔ میں سچ کہتا ہوں ابرہام کا یہ بیٹا اسماعیل تھا، جس کی نسل سے مسیح آنے کو ہے، جس کا ابرہام سے وعدہ تھا کہ اسی میں زمین کے تمام قبیلے برکت پائیں گے۔

(۱) انجیل برناباس، فصل ۱۳، ص ۳۷-۳۸

(۲) حوالہ سابق، فصل ۹۹ ص ۱۴۵-۱۴۶

تب یہ سن کر سردار کاہن غضبناک ہو گیا اور چیخ اٹھا: آؤ اس بدعقیدہ شخص کو سنگسار کر دیں۔ یہ تو کوئی اسماعیلی ہے۔ اس نے موسیٰ اور خدا کی شریعت کے خلاف کفر بکا ہے۔"

ایک مرتبہ شاگردوں کے اسی قسم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے عیسیٰؑ نے فرمایا:۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم فرشتے جبرئیل کے الفاظ پر غور کرو تو تم ہمارے فقیہوں اور عالموں کا بغض جان لو گے۔ کیونکہ فرشتے نے کہا۔ ابرہام ساری دنیا جان لے گی کہ خدا تجھ سے کتنی محبت رکھتا ہے، پر دنیا یہ کیونکر جانے کہ تجھے خدا سے کتنی محبت ہے؟ یقیناً یہ ضروری ہے کہ تو خدا کی محبت کے لیے کچھ کر۔ ابرہام نے جواب دیا، دیکھو خدا کا بندہ جو کچھ خدا کی مرضی ہو کرنے کو تیار ہے۔ تب خدا نے ابرہام سے فرمایا: اپنا بیٹا اپنا پہلوٹھا اسماعیل لے اور پہاڑ پر آ کر اس کی قربانی دے۔ سو اضحاق پہلوٹھا کیوں کر ہوا کہ جب اضحاق پیدا ہوا تو اسماعیل سات سال کا تھا؟"

ختنہ: عہدِ الٰہی کا نشان

بائبل میں حضرت ابراہیمؑ کے ختنہ کا بھی ذکر ہے۔ یہ اس عہد کا نشان ہے، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور آپ کی نسل سے کیا تھا:

"تب ابرام سرنگوں ہو گیا اور خدا نے اس سے ہم کلام ہو کر فرمایا:...... میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کی سب پشتوں کے لیے اپنا عہد جو ابدی ہو گا باندھوں گا تاکہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا رہوں اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے، ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے اور میں ان کا خدا ہوں گا، پھر خدا نے ابرہام سے کہا کہ تو میرے عہد کو ماننا اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت اسے مانے اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور یہ اس عہد کا نشان ہو گا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ تمہارے یہاں پشت در پشت ہر لڑکے کا ختنہ جب وہ آٹھ روز کا ہو کیا جائے۔ خواہ وہ گھر میں پیدا ہو خواہ اسے کسی پردیسی سے خریدا ہو جو تیری نسل سے نہیں۔ لازم ہے کہ تیرے خانہ زاد اور تیرے زر خرید کا ختنہ کیا جائے اور

میرا عہد تمہارے جسم میں ابدی ہوگا اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے کیونکہ اس نے میرا عہد توڑا"۔(۱)

بائبل ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم الٰہی کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ اور سب خانہ زادوں اور زر خریدوں کو لیا اور خدا کے حکم کے مطابق ان کا ختنہ کیا۔ اس وقت حضرت اسماعیلؑ کی عمر تیرہ سال تھی۔(۲)

یہود کہتے ہیں کہ عہد الٰہی کے مستحق اصلاً حضرت اسحاقؑ ہیں۔ اس لیے انھی کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے کنعان کا ملک عنایت کیا۔ اور اس عہد کی علامت کے طور پر ختنہ مشروع کیا۔ اگر بات یہ ہے تو اس کے مستحق حضرت اسحاقؑ سے پہلے حضرت اسماعیل قرار پاتے ہیں کیوں کہ ان کا ختنہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے ایک سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔

انجیل برناباس میں صراحت ہے کہ عہد الٰہی اسماعیل کی نسل میں کیا گیا تھا نہ کہ اسحاقؑ کی نسل میں۔ شاگردوں کی ایک مجلس میں حضرت عیسیٰ نے فرمایا۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ہر نبی جب آیا ہے، خدا کی رحمت کا نشان صرف ایک قوم کے لیے لایا ہے اور اسی لیے اس کا کلام نہ پھیلا، سوائے ان لوگوں تک سے جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ پر خدا کا رسول جب وہ آئے گا تو خدا اسے گویا اپنے ہاتھ کی مہر عطا کرے گا۔ وہ دنیا کی تمام قوموں کے لیے جو اس کا دین قبول کریں گی نجات اور رحمت لائے گا۔ وہ بے دینوں پر طاقت کے ساتھ آئے گا اور بت پرستی مٹا دے گا یہاں تک کہ وہ شیطان کو مبہوت کر دے گا کیونکہ خدا نے ابرہام سے یہی وعدہ کیا تھا کہ دیکھ تیری نسل میں میں زمین کے تمام قبیلوں کو برکت دوں گا اور جس طرح اے ابرہام تو نے بت پاش پاش کیے اسی طرح تیری نسل بھی کرے گی۔ یعقوبؑ نے جواب میں کہا اے استاد ہمیں بتا کہ یہ وعدہ کس میں کیا گیا تھا۔ کیوں کہ یہودی کہتے ہیں اضحاق میں اور اسماعیلی کہتے ہیں اسماعیلی میں...... یسوع نے کہا..... یقین کرو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ وعدہ اسماعیل میں تھا نہ کہ اضحاق میں۔

اس پر شاگردوں نے کہا: اے استاد! موسیٰ کی کتاب میں یوں لکھا ہے: یہ وعدہ اضحاق میں کیا گیا تھا۔

---

(۱) کتاب پیدائش، باب ۱۷: ۳-۱۴

(۲) حوالہ سابق باب ۱۷: ۲۳-۲۵

یسوع نے کراہ کر جواب دیا: ایسا ہی لکھا ہے مگر موسیٰ نے نہیں لکھا نہ یشوع نے لکھا، بلکہ ہمارے ربیوں نے، جو خدا سے نہیں ڈرتے۔"(۱)

ولادتِ اسحاقؑ

اللہ تعالیٰ نے اکلوتے بیٹے کو قربانی کا حکم دے کر حضرت ابراہیمؑ کی جو آزمائش کی تھی، جب وہ اس میں پورے اترے تو اس نے حضرت سارہ سے بھی ایک بیٹے کی بشارت دی۔ بائبل کے مطابق اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ایک سو سال اور حضرت سارہ کی عمر نوے سال تھی۔ سورۂ صافات میں واقعۂ ذبح کے بعد ہے:

وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَo وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰى إِسْحَاقَ ط (الصافات: ۱۱۲، ۱۱۳)

"اور ہم نے اسے اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔ اور اسے اور اسحاقؑ کو برکت دی۔"

بائبل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعے پر اللہ تعالیٰ نے اسحاقؑ اور اسماعیل دونوں کے لیے برکت کا وعدہ کیا تھا:

"اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے، سو اس کو ساری نہ پکارنا، اس کا نام سارہ ہوگا اور میں اسے برکت دوں گا اور اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا یقیناً میں اسے برکت دوں گا کہ قومیں اس کی نسل سے ہوں گی اور عالم کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے ...... اور ابرہام نے خدا سے کہا: کاش اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔ تب خدا نے فرمایا: اور اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔(۲)

یہ بشارت حضرت ابراہیمؑ کو فرشتوں کے واسطے سے دی گئی۔ فرشتے اجنبی انسانوں کے بھیس میں ان کے ہاں پہنچے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ مگر انہیں کھانے پر آمادہ نہ دیکھ کر طرح طرح کے اندیشے کرنے لگے۔ فرشتوں نے ان کی گھبراہٹ دور کرتے

(۱) برناباس کی انجیل فصل ۴۴، ص ۷۹-۸۰

(۲) کتاب پیدائش باب ۱۷: ۱-۲۰

ہوئے انہیں حضرت سارہ سے ایک بیٹے کی بشارت دی۔ حضرت سارہ یہ گفتگو سن رہی تھیں۔ انھوں نے انتہائی حیرت کا اظہار کیا کہ کیا اب بڑھاپے میں مجھ سے اولاد ہوگی؟ فرشتوں نے اطمینان دلایا کہ اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے۔

قرآن کریم میں مختلف مقامات پر یہ واقعہ بہت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ الحجر میں ہے:

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ۝ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلٰمًا ؕ قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ۝ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيمٍ ۝ قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلٰى أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ۝ قَالُوا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقٰنِطِينَ ۝ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهٖ إِلَّا الضَّآلُّونَ ۝ (الحجر: ۵۱-۵۶)

اور انہیں ابراہیمؑ کے مہمانوں کا قصہ سناؤ۔ جب وہ آئے اس کے ہاں اور کہا "سلام ہو تم پر" تو اس نے کہا: "ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے" انھوں نے جواب دیا: ڈرو نہیں ہم تمہیں ایک بڑے سیانے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں" ابراہیمؑ نے کہا: کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟" انھوں نے جواب دیا: "ہم تمہیں برحق بشارت دے رہے ہیں تم مایوس نہ ہو" ابراہیمؑ نے کہا: "اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں"

اور سورۃ الذاریات میں ہے:

هَلْ أَتٰكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ۝ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُنْكَرُونَ ۝ فَرَاغَ إِلٰى أَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ ۝ فَقَرَّبَهٗ إِلَيْهِمْ قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝ فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ؕ قَالُوا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوهُ بِغُلٰمٍ عَلِيمٍ ۝ فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهٗ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ ۝ قَالُوا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ إِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۝ (الذاریات: ۲۴-۳۰)

اے نبی! ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمھیں پہنچی ہے؟ جب وہ اس کے یہاں آئے تو کہا: ''آپ کو سلام ہے'' اس نے کہا: آپ لوگوں کو بھی سلام ہے۔ کچھ نا آشنا سے لوگ ہیں۔ پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ایک (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لا کر مہمانوں کے آگے پیش کیا۔ اس نے کہا آپ حضرات کھاتے کیوں نہیں؟ پھر وہ اپنے دل میں ان سے ڈرا۔ انھوں نے کہا ڈریے نہیں اور اسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا۔ یہ سن کر اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی: بوڑھی بانجھ! انھوں نے کہا: ''یہی کچھ فرمایا ہے تیرے رب نے، وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

چونکہ فرشتے انسانی شکل میں آئے تھے، اس لیے حضرت ابراہیمؑ انہیں پہچان نہیں سکے تھے اور انہیں اجنبی نو وارد سمجھ کر ان کی خاطر داری اور مہمان نوازی میں مصروف ہو گئے تھے۔ اسی لیے مذکورہ آیات میں انھیں ''ضیف ابراہیم'' (ابراہیمؑ کے مہمان) کہا گیا ہے۔ فرشتوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ گھبرا گئے۔ مفسرین نے اس کی دو وجہیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کی دعوت قبول کرنے سے انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو بری نیت سے آیا ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ مجھے نقصان پہنچانے نہ آئے ہوں۔ دوسری یہ کہ حضرت ابراہیمؑ تاڑ گئے تھے کہ ہو نہ ہو یہ فرشتے ہیں اور چونکہ فرشتے اس بھیس میں اسی وقت آتے ہیں جب کسی قوم کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ گھبرا گئے تھے۔ (1)

فرشتوں کے بشارت دینے پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ کا ردعمل کیا تھا؟ سورۂ حجر میں ہے کہ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے حیرت کا اظہار کیا تھا کہ کیا اب بڑھاپے میں اولاد ہوگی؟ (آیت ۵۴) جب کہ سورۃ الذاریات میں ہے کہ حیرت کا اظہار حضرت سارہ نے کیا تھا کہ میں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گئی ہوں اور بانجھ ہوں پھر یہ کیسی بشارت (آیت ۲۹) یہ واقعہ سورۂ ہود میں بھی مذکور ہے وہاں دونوں باتیں حضرت سارہ کی زبان سے ادا ہوئی ہیں۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ○ (ھود: ۷۲)

وہ بولی ہائے میری کم بختی! کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جب کہ میں بڑھیا پھونس ہوگئی اور میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے''

(۱) تفسیر کبیر ۵/۷۵، تفسیر قرطبی ۹/۶۵، تدبر قرآن ۳/۴۰۳

ایسی صورت حال میں کہ شوہر اور بیوی دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گئے ہوں اور بیوی بانجھ بھی ہو، اولاد کی بشارت دونوں کے لیے انتہائی حیرت اور مسرت کا باعث ہوئی ہوگی، جس کا دونوں نے بے ساختہ اظہار کیا۔ حضرت اسحاقؑ کے نام کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے۔ اس کا تلفظ عبرانی میں ''یضحق'' ہے، جس کے معنی ہیں ہنسی آنا۔ ان کا یہ نام اس لیے تجویز ہوا کہ ان کی بشارت پر حضرت سارہ کو ہنسی آگئی تھی۔

فرشتوں کے ذریعے ولادت اسحاقؑ کی بشارت کا واقعہ بائبل میں بھی ہے۔ البتہ وہ قرآن کے بیان سے کچھ مختلف ہے۔ مثلاً اس میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے کھانا پیش کرنے پر فرشتوں نے اسے تناول کیا تھا۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ فرشتوں نے جب دریافت کیا کہ سارہ کیوں ہنسی تو سارہ انکار کر گئی کہ میں نہیں ہنسی کیونکہ وہ ڈرتی تھی۔ (۱)

قوم لوط اور اس کا انجام

گزشتہ صفحات میں متعدد مقامات پر حضرت لوطؑ کا تذکرہ آچکا ہے۔ بائبل کے مطابق وہ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ (۲) ان کی پرورش اور تربیت حضرت ابراہیمؑ ہی کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت پر جن لوگوں نے لبیک کہا تھا، قرآن نے ان میں سے حضرت لوطؑ کے نام کی صراحت کی ہے (العنکبوت:۲۶)۔ حضرت ابراہیمؑ وطن سے ہجرت کر کے جہاں جہاں تشریف لے گئے، وہاں لوطؑ ان کے ساتھ رہے۔

مصر سے واپسی کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے کنعان میں سکونت اختیار کی۔ وہاں سے قریب سدوم اور عمورہ نامی بستیاں تھیں جو بحر مردار کے جنوب مشرق میں آباد تھیں۔ یہ علاقہ آج کل عراق اور فلسطین کے درمیان واقع ہے اور شرق اردن کہلاتا ہے۔ تباہ ہونے سے پہلے یہ خوب سرسبز وشاداب تھا اور وہاں باغوں کی کثرت تھی۔ لیکن وہاں کے لوگ اللہ تعالیٰ کو بھولے ہوئے تھے اور مختلف برے کاموں میں ملوث تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت لوطؑ کو مبعوث کیا تو وہ حضرت ابراہیمؑ سے جدا ہو کر سدوم کے علاقے میں چلے گئے۔

(۱) کتاب پیدائش، باب ۱۸: ۸، ۱۵

(۲) کتاب پیدائش باب ۱۱: ۲۷، بائبل ہی میں بعد میں بعض مقامات پر انہیں حضرت ابراہیم کا بھائی کہا گیا ہے دیکھیے کتاب پیدائش باب ۱۳: ۸، باب ۱۴: ۱۶

بائبل کا بیان اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مصر سے واپسی پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ دونوں کے پاس بڑے بڑے ریوڑ اور مال واسباب ہو گئے تھے جس کی بنا پر دونوں کے چرواہوں میں آئے دن جھگڑے ہونے لگے تھے۔ اس کا حل دونوں نے یہ نکالا کہ اپنے علاقے تقسیم کر لیے اور ایک دوسرے سے جداگانہ رہائش اختیار کر لی۔ (۱)

قوم لوط نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے۔ اور دوسری بہت سی معصیتوں اور فواحش کا ارتکاب کرنے لگے۔ کوئی برائی ان کے نزدیک برائی نہیں رہ گئی۔ چنانچہ بغیر کسی شرم اور جھجک کے، علانیہ انھیں کرنے لگے۔ نفسانی خواہشیں پوری کرنے کا انھوں نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا، جس کا دنیا کی قوموں میں اس وقت تک کوئی رواج نہ تھا۔ حضرت لوطؑ نے ان فواحش و منکرات پر ان کی سخت سرزنش کی۔ انھیں سمجھایا بجھایا اور اللہ سے ڈرایا۔ قرآن میں حضرت لوطؑ کی دعوت مختلف مقامات پر مذکور ہے۔

سورۂ عنکبوت میں ہے:

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَاسَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ○ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ (العنکبوت:۲۸-۲۹)

اور ہم نے لوط کو بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: تم تو وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ کیا تمہارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو، اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو؟

حضرت لوطؑ کی دعوت کا ان کی قوم نے کوئی اثر نہیں لیا۔ الٹا انھیں استہزا اور طنز و تحقیر کا نشانہ بنانے لگے۔ انھیں ان کی برائیوں پر ملامت کی گئی تو شرمندہ ہونے کی بجائے بڑی ڈھٹائی سے آپس میں کہنے لگے کہ ہمیں ملامت کرنے والے بڑے پارسا بنتے ہیں، انھیں بستی سے نکال دو:

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ○ (الاعراف:۸۲)

(۱) کتاب پیدائش باب ۱۳

اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "نکالو ان لوگوں کو اپنی بستیوں سے، بڑے پاکباز بنتے ہیں یہ"

حضرت لوطؑ نے انہیں وعید سنائی اور ان سے فرمایا: اگر تم ان معصیتوں سے باز نہ آئے تو اللہ کی گرفت اور اس کے عذاب کا شکار ہو جاؤ گے۔ اس کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ (العنکبوت: ۲۹)

پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ انھوں نے کہا "لے آ اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے"۔

قوم لوط کی بداعمالیاں جب حد سے تجاوز کر گئیں تو اللہ تعالیٰ نے انھیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت لوطؑ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے قریبی عزیز تھے اور ان کی قوم کی بستیاں حضرت ابراہیمؑ کی جائے رہائش سے قریب ہی تھیں اس لیے انہیں اس کی اطلاع دی گئی۔

فرشتوں نے جہاں ایک طرف حضرت ابراہیمؑ کو سارہ سے اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت دی، وہیں دوسری طرف قوم لوط کی بداعمالیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے ہلاک کر دیے جانے کے فیصلۂ الٰہی سے بھی باخبر کیا۔ سورۂ عنکبوت میں ہے:

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ○ (العنکبوت: ۳۱)

اور جب ہمارے فرستادے ابراہیمؑ کے پاس بشارت لے کر پہنچے تو انھوں نے اس سے کہا: ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ اس کے لوگ سخت ظالم ہو چکے ہیں۔

سورۂ ذاریات سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ولادت اسحاقؑ کی بشارت دی۔ لیکن وہ اپنی نبوی فراست سے تاڑ گئے تھے کہ اس مخصوص ہیئت میں فرشتوں کے آنے کا مقصد محض بشارت دینا نہیں ہے بلکہ وہ کسی دوسرے مشن پر نکلے ہوئے ہیں۔ دریافت کرنے پر فرشتوں نے تفصیل بتائی۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ○ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ○ۙ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ○ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ○ (الذّٰریٰت: ۳۱-۳۴)

ابراہیمؑ نے کہا: "اے فرستادگان الٰہی آپ کو کیا مہم درپیش ہے؟ انھوں نے کہا: "ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ تاکہ اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسا دیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لیے نشان زدہ ہیں۔

فرشتوں کی اس اطلاع پر حضرت ابراہیمؑ پریشان ہو گئے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس بستی میں تو لوط ابھی موجود ہیں۔ پھر اسے کیوں کر ہلاک کیا جائے گا؟ فرشتوں نے اطمینان دلایا کہ حضرت لوط کے اس بستی سے دور کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانے کے بعد اسے تباہ کیا جائے گا۔

قَالَ اِنَّ فِيۡهَا لُوۡطًا‌ ؕ قَالُوۡا نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِيۡهَا‌ ۖ لَـنُـنَجِّيَنَّهٗ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۖ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ○ (العنکبوت:۳۲)

ابراہیمؑ نے کہا "وہاں تو لوط موجود ہے" انھوں نے کہا ہم خوب جانتے ہیں وہاں کون کون ہے۔ ہم اسے اور اس کی بیوی کے سوا اس کے باقی سب گھر والوں کو بچا لیں گے" اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔

حضرت ابراہیمؑ صرف اپنے بھتیجے لوط ہی کے لیے فکر مند نہیں تھے، بلکہ انھیں قوم لوط کی ہلاکت کی خبر بھی بے چین کیے دے رہی تھی۔ وہ بڑے متحمل المزاج اور بردبار تھے۔ انھوں نے بارگاہ الٰہی میں درخواست کی کہ اس قوم کو ابھی کچھ اور مہلت دی جائے اور عذاب کچھ دنوں کے لیے ٹال دیا جائے۔ بائبل میں اس موقع کی کچھ تفصیل مذکور ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی:

"کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا۔ شاید اس شہر میں پچاس راست باز ہوں۔ کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راست بازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا۔ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا۔"[1]

انہیں بتایا گیا کہ اس بستی میں پچاس راست باز بھی نہیں۔ وہ بار بار درخواست کرتے رہے۔ اور راست بازوں کی تعداد تھوڑی تھوڑی کم کر کے ان کے حوالے سے مہلت مانگتے

(۱) کتاب پیدائش باب ۱۸: ۲۳-۲۵

رہے۔ پینتالیس، چالیس، تیس، بیس، دس۔ یہاں تک کہ جب انہیں یہ خبر دی گئی کہ اس بستی میں دس راست باز بھی نہیں ہیں، تو وہ خاموش ہو گئے۔ (۱)

قرآن نے اس موقعے کا بہت ایجاز کے ساتھ ذکر کیا ہے اور بڑی بلیغ تعبیر اختیار کی ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرٰهِيمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ ۝ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ ۝ يَا إِبْرٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ إِنَّهُ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَإِنَّهُمْ اٰتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ۝ (ھود: ۷۴-۷۶)

پھر جب ابراہیمؑ کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور (اولاد کی بشارت سے) اس کا دل خوش ہو گیا تو اس نے قوم لوط کے معاملے میں ہم سے جھگڑا شروع کیا۔ حقیقت میں ابراہیمؑ بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا۔ اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔ (آخر کار ہمارے فرشتوں نے اس سے کہا) اے ابراہیمؑ اس سے باز آ جاؤ، تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور اب ان لوگوں پر وہ عذاب آ کر رہے گا جو کسی کے پھیرے نہیں پھر سکتا۔

یہاں 'حلیم' اور 'اوّاہ' کے ذریعے حضرت ابراہیمؑ کے نمایاں اوصاف کی جانب اشارہ ہے اور لفظ "یجادلنا" (ہم سے جھگڑا کرنے لگا) اس منظر کو پیش کرتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ سے عذاب کچھ ٹالنے کی درخواست کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب اس قوم سے خیر کی کوئی امید نہیں ہے۔ پھر بھی وہ درخواست کیے جاتے ہیں کہ اسے مزید کچھ مہلت دے دے۔ ہو سکتا ہے یہ اپنے رویے کو درست کر لیں۔

بالآخر قوم لوط برے انجام کو پہنچی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا۔ اس پر پتھروں کی بارش کی اور اسے رہتی دنیا تک کے لیے نمونۂ عبرت بنا دیا:

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ ۝ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ ۝ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ۝ (الحجر: ۷۳-۷۵)

(۱) حوالہ سابق، باب ۱۸: ۲۶-۳۲

آخر کار پو پھٹتے ہی ان کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا اور ہم نے اس بستی کو تل پٹ کر کے رکھ دیا۔ اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی۔

عبدالوہاب نجار نے لکھا ہے: ''میرا خیال ہے کہ بحر مردار جو آج کل بحیرۂ لوط کے نام سے معروف ہے، اس کا اس واقعہ سے پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ زلزلہ کی بنا پر یہ بستی تلپٹ ہوگئی اور اس کی سطح زمین سمندر کی سطح سے چار سو میٹر نیچے ہوگئی''(۱)

جرہم کی آبادی

حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کو وادی مکہ میں سکونت اختیار کیے ہوئے ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس وادی سے جرہم نامی ایک قافلے کا گزر ہوا۔ جو شام جانا چاہتا تھا۔ اس نے وہاں پانی دیکھا تو حضرت ہاجرہ کی اجازت سے وہیں پڑاؤ ڈال دیا، اور پھر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کی وہ دعا پوری ہوئی، جو انھوں نے مکے کی بے آب و گیاہ وادی کو آباد کرنے کے لیے کی تھی۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی ایک طویل روایت میں جرہم کی سکونت کا تذکرہ ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''جرہم کا ایک قافلہ جو کداء کے راستے سے آرہا تھا، وہاں سے گزرا۔ قافلے کے لوگوں نے مکہ کے نشیبی حصے میں پڑاؤ ڈالا۔ انھوں نے پرندے کو منڈلاتے دیکھا تو کہنے لگے کہ ضرور یہاں کہیں پانی ہے۔ لیکن ہم تو اس وادی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہاں کہیں پانی نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے تحقیق حال کے لیے بعض لوگوں کو بھیجا۔ انھوں نے پانی کی موجودگی کی اطلاع دی۔ پانی کے پاس حضرت اسماعیل کی ماں رہ رہی تھیں۔ ان لوگوں نے ان سے درخواست کی: کیا آپ ہمیں اپنے پاس رہنے کی اجازت دیں گی؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں لیکن پانی پر تم لوگوں کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ ان لوگوں نے یہ شرط منظور کر لی۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) قصص الانبیاء۔ عبدالوہاب نجار ص ۱۱۳

قرآن میں عذاب کے فرشتوں کی قوم لوط کی بستی میں آمد، قوم کے ان کے اور حضرت لوطؑ کے ساتھ برتاؤ اور پھر ان پر عذاب کی تفصیلات مذکور ہیں۔ موضوع سے براہ راست متعلق نہ ہونے کی وجہ سے انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ قرآن میں ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے۔ العنکبوت: ۳۱-۳۵، الحجر: ۶۱-۷۷، ھود: ۷۷-۸۳

نے فرمایا: ’ام اسماعیل نے مذکورہ شرط کے ساتھ ان لوگوں کا رہنا اس لیے منظور کر لیا کہ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے وہاں رہنے سے ان کی تنہائی دور ہو جائے۔ ان لوگوں نے وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی اور اپنے گھر والوں کو بھی وہیں بلا لیا‘‘ (۱)

جرہم کا تعلق یمن سے تھا۔ وہ قحطان کی نسل سے تھے۔ ان کے جد امجد کا سلسلۂ نسب یہ ہے: بن یقطن بن عابر بن شالخ۔ یہ لوگ ’یعرب‘ کے بنو عم تھے۔ (۲)

جرہم کے لوگ یمن سے ہجرت پر کیوں مجبور ہوئے تھے؟ اس سلسلے میں مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ اس کا سبب اس علاقے کی قحط سالی تھی۔ انھوں نے پانی چارہ اور وسائل رزق کی تلاش میں تہامہ کا رخ کیا۔ جب وہ اس وادی میں پہنچے تو پانی دیکھ کر وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ (۳) اس کے برخلاف ابن ہشام نے باہمی جنگوں کو اس کا سبب قرار دیا ہے۔ اس نے لکھا ہے:

’’عاد و ثمود کی ہلاکت کے بعد کے زمانے میں جب بنو قحطان بہت پھیل گئے تھے اور ان کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی تو ایک موقعے پر ان کے اور بنو حمیر کے درمیان جنگ ہوئی۔ بنو حمیر کی تمام شاخوں نے متحد ہو کر جرہم سے جنگ کی۔ صرف بنو قبطون نامی شاخ نے ساتھ نہیں دیا۔ بنو حمیر جرہم سے زیادہ طاقت ور تھے۔ اور ان کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ انھوں نے جرہم اور بنو قبطون دونوں کو جلاوطن کر دیا۔ انھوں نے وہاں سے چلے جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ یہ لوگ ارض حرم میں پہنچے۔ ان دنوں وہاں عمالیق کی سکونت تھی۔ اور حرم میں درختوں اور جھاڑیوں کی اتنی کثرت تھی کہ پڑاؤ ڈالنا ممکن نہ تھا۔ انھوں نے زمین صاف کی۔ جرہم نے مکے کے بالائی حصے میں اور بنو قبطون نے نشیبی حصے میں سکونت اختیار کی‘‘ (۴)

حضرت اسماعیلؑ کی آل و اولاد

بائبل یا قرآن سے حضرت اسماعیل کے بچپن کے بعد کی زندگی پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ بائبل سے اتنا معلوم ہوتا ہے:

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قولہ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا

(۲) المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام۔ جواد علی، ۴/۱۳

(۳) مروج الذہب، مسعودی، ۳/۹۱-۹۳

(۴) کتاب التیجان فی ملوک حمیر، ابن ہشام، ۱/۳۹۶-۳۹۸

"خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا۔"(۱)

یہود کہتے ہیں کہ "فاران کے بیابان" سے مراد فلسطین سے متصل علاقہ ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد وادی مکہ ہے، جہاں حضرت اسماعیلؑ اپنی ماں کے ساتھ رہتے تھے۔

مکہ ایک شہر بن گیا۔ جرہم کی آبادی بڑھ گئی۔ حضرت اسماعیلؑ بھی جوانی کی عمر کو پہنچ گئے تو ان کی ماں نے اس قبیلے کی ایک لڑکی سے ان کی شادی کر دی۔

حضرت ابراہیمؑ اپنے گھر والوں کی خبر گیری کے لیے وقتاً فوقتاً کنعان سے تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آئے تو حضرت اسماعیلؑ موجود نہ تھے۔ بہو نے تنگی اور پریشان حالی کی شکایت کی۔ اس کی ناشکری و بے صبری دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو اشارۃً اسے علیحدہ کر دینے کا مشورہ دیا۔ حضرت اسماعیلؑ نے اسے طلاق دے کر اسی قبیلے کی ایک دوسری خاتون سے شادی کی۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے اس پر تفصیل سے روشنی پڑتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ وقتاً فوقتاً حضرت اسماعیلؑ سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ کی شادی کے بعد ایک مرتبہ آئے تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ اپنی بہو سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ ہمارے لیے روزی روٹی کا سامان تلاش کرنے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے کھانے پینے اور رہن سہن کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا: ہم بہت ہی تنگی اور پریشانی میں ہیں اور بہت تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اور ادھر ادھر کی بہت سی شکایتیں کیں۔ یہ سن کر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ جب تمہارا شوہر آجائے تو اسے میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دے۔ حضرت اسماعیلؑ گھر آئے تو بیوی نے سارا حال کہہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ ایک بڑے میاں آئے تھے۔ فلاں فلاں باتیں پوچھ رہے تھے۔ میں نے سب کچھ بتا دیا تو جاتے جاتے آپ سے کہہ گئے ہیں کہ آپ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دیں۔ حضرت اسماعیلؑ سمجھ گئے۔ کہنے لگے کہ وہ میرے والد تھے۔ انھوں نے مجھ سے طلاق دینے کو کہا ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔

(۱) کتاب پیدائش، باب ۲۱: ۲۰-۲۱

اس کے بعد حضرت اسماعیلؑ نے دوبارہ وہیں شادی کی۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت ابراہیمؑ پھر تشریف لائے۔ اس دن بھی ان کی ملاقات حضرت ابراہیمؑ سے نہیں ہوئی۔ گھر میں صرف ان کی بیوی تھیں۔ اس سے دریافت کیا اس نے بتایا کہ "وہ ہمارے لیے روزی کی تلاش میں گئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے گھر کا حال پوچھا تو اس نے جواب دیا" ہم بہت خوش حالی اور فارغ البالی کے ساتھ رہتے ہیں۔ کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہے" اور اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس کی حمد وثنا بیان کی۔ کھانے پینے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ گوشت کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان میں برکت کی دعا کی اور جاتے ہوئے فرمایا: اسماعیلؑ آجائیں تو انہیں میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ کو باقی رکھیں۔ جب حضرت اسماعیلؑ آئے تو انھیں کسی کے آنے کا شبہ ہوا۔ انھوں نے بیوی سے پوچھا: کیا کوئی یہاں آیا تھا؟ اس نے بتایا: ہاں ایک بزرگ آئے تھے اور فلاں فلاں باتیں دریافت کر رہے تھے۔ پھر اس نے تمام باتیں بتائیں اور کہا کہ وہ جاتے ہوئے یہ بھی کہہ گئے کہ میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ اس دروازے کی چوکھٹ کو برقرار رکھیں۔ اس نے ان بزرگ کی بڑی تعریف کی۔ اس پر اسماعیلؑ نے کہا: وہ میرے والد تھے اور چوکھٹ سے مراد تم ہی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تم کو طلاق نہ دوں"(۱)

ان خاتون کا نام تاریخ کی بعض کتابوں میں رعلہ بنت مضاض، بعض میں سیدہ بنت مضاض اور بعض میں حنفاء بنت حارث بن مضاض مذکور ہے۔(۲) ان سے حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے ہوئے۔ ان کے نام یہ ہیں"۱۔ نبایوت ۲۔ قیدار ۳۔ ادبیل ۴۔ مبسام ۵۔ مشماع ۶۔ دومہ ۷۔ مسا ۸۔ حدد ۹۔ تیما ۱۰۔ یطور ۱۱۔ نفیس ۱۲۔ قدمہ

بائبل کے مطابق یہ بارہ لوگ اپنے اپنے قبیلے کے سردار ہوئے اور انھیں کے ناموں سے ان کی بستیاں اور چھاونیاں نامزد ہوئیں۔(۳)

حضرت اسماعیل اور ان کی ذریت کے، جزیرۃ العرب میں آباد ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ تاریخ میں جزیرۃ العرب کے کئی مقامات کے نام حضرت اسماعیل کے انھیں فرزندوں کے

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب یزفون النسلان فی المشی

(۲) سیرۃ النبی۔ ابن ہشام ۱/۴-۵، قصص الانبیاء ثعلبی ص ۱۰۷، تاریخ یعقوبی ص ۱۵۲

(۳) کتاب پیدائش باب ۲۵: ۱۶

ناموں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی بستیاں تھیں۔ ینبوع سے متصل آبادی کا نام نبیت ہے، جو نبایوت سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے قریب ایک علاقہ کا نام الحفیر ہے، جو قیدار کی بگڑی شکل معلوم ہوتا ہے۔ مسماع نجد میں ہے جو مشماع سے منسوب ہے۔ شام اور مدینہ کے درمیان ایک مشہور شہر دومتہ الجندل ہے جو دومہ سے منسوب ہے۔ یمن کے ایک شہر کا نام موسے ہے، جو مستا سے ملتا جلتا ہے۔ جنوبی عرب میں ایک علاقہ حدیدہ ہے جہاں ایک مشہور قبیلہ بنو حدد رہتا ہے جو بظاہر حدد کی نسل سے ہے۔ خیبر کی راہ پر فدک سے قریب تیما ہے، جو غالبًا تیما سے منسوب ہے۔ یمن کا ایک شہر قیدماہ ہے، جہاں ایک قبیلہ بنو قدماں رہتا ہے۔ شاید یہ قدمہ کی نسل سے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل جزیرۃ العرب ہی کے کسی مقام پر رہے، وہیں ان کی نسل آباد ہوئی۔ (۱)

حضرت اسماعیل کے بارے میں بائبل میں مذکور ہے:

"وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا" (۲)

اسی طرح ان کی اولاد کا مسکن یہ بتایا گیا ہے:

"اور اس کی اولاد حویلہ سے اشور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے، جس سے اسور کو جاتے ہیں، آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسے ہوئے تھے" (۳)

"مصر کے سامنے" اور "سب بھائیوں کے سامنے" جیسی تعبیرات سے بظاہر معلوم ہوتا ہے اور یہود نے بھی یہی تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت کی جائے رہائش کنعان سے قریب کہیں پر تھی۔ لیکن یہ قطعًا صحیح نہیں۔ مولانا فراہی نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسکن اسماعیل کو تمام ذریت ابراہیمؑ کا قبلہ قرار دیا تھا۔ اس کے اثبات میں فرماتے ہیں:

"سب بھائیوں کے سامنے بسنے کی جو تاویل ہم نے کی ہے اس کے سوا اس کی کوئی دوسری صحیح تاویل ممکن نہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی تمام اولاد ماسوا بنی

---

(۱) رحمۃ للعالمین ۲/۵۲-۵۳۔ سر سید احمد خاں نے اس دلیل کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور انگریز جغرافیہ دانوں کے حوالے سے اس کا اثبات کیا ہے۔ دیکھئے الخطبات الاحمدیۃ فی العرب والسیرۃ المحمدیۃ، ص ۴۹۵-۴۹۸

(۲) کتاب پیدائش، باب ۱۶:۱۲

(۳) حوالہ سابق باب ۲۵:۱۸

اسماعیل کے مشرق وشمال میں آباد ہوئی۔ پس حضرت اسماعیل ان سب کے سامنے اسی وقت ہو سکتے ہیں، جب یہ مانا جائے کہ ان کی بستی ان سب کے قبلہ کی سمت تھی اور اس کو مان لینا بہت اقرب ہے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے سب کا امام بنایا تھا اور ان کے بعد امامت کے وارث حضرت اسماعیلؑ ہوئے''۔(۱)

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو اپنی بڑی قربانیوں کا رخ جنوب کی سمت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ ان کے لیے قدس الاقداس نامی قربانی کے لیے جنوب کی سمت کرنا ضروری تھا۔ سالانہ قربانی جو سب سے بڑی قربانی تصور کی جاتی تھی، اس کا رخ بھی جنوب کی طرف ہوتا تھا۔ قربانیوں کا رخ جنوب کی جانب ہونے کی حکمت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ جو شخص خداوند کے حضور آئے اس کا رخ لازماً خانہ کعبہ کی طرف ہو، جس کے پاس مروہ ہے، جس کو اولین قربان گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے اور جس کے پاس ہی مسکن اسماعیل بھی ہے''۔(۲)

---

(۱) ذبیح کون ہے؟ فراہی ص ۷۶

(۲) تفصیل کے لیے دیکھئے ذبیح کون ہے؟ ص ۷۴

خانۂ کعبہ کی تعمیر

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے ہزاروں میل کا سفر کیا۔ مختلف علاقوں میں تشریف لے گئے اور بہت سی قوموں اور قبیلوں میں وقت گزارا۔ انھوں نے ہر جگہ یہی دیکھا کہ لوگ اللہ واحد کی عبادت کرنے کی بجائے مٹی پتھر کے بے جان بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ستاروں اور سیاروں کو اپنا معبود بناتے ہیں، ان کے ہیکل اور عبادت خانے تعمیر کرتے ہیں اور ان کے سامنے نذر و نیاز گزارتے ہیں۔ انھوں نے ہر جگہ لوگوں کو شرک سے روکا اور انھیں توحید کی دعوت دی۔ انھوں نے جہاں بھی سکونت اختیار کی وہاں ایک قربان گاہ بنائی۔

اب ضرورت تھی کہ ایک ایسا گھر تعمیر ہو جو توحید کا مرکز بنے۔ جہاں صرف اللہ واحد کی عبادت ہو، جہاں سے ہدایت کی کرنیں پھوٹیں اور پوری دنیا کو منور کر دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی نشان دہی پر حضرت ابراہیمؑ نے وادی مکہ میں یہ گھر تعمیر فرمایا:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○

(الحج:۲۶)

یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

تعمیرِ کعبہ حضرت ابراہیمؑ سے قبل

خانہ کعبہ کی تعمیر سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں ہوئی یا

ان سے پہلے ہو چکی تھی، ان دونوں نے اس کی تجدید کی؟ اس سلسلے میں کوئی صراحت قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے۔ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے:

''نبی معصوم سے مروی کسی صحیح حدیث میں نہیں ہے کہ بیت اللہ ابراہیم خلیل اللہ سے قبل موجود تھا۔ جو لوگ اس سلسلے میں ''مکان البیت'' سے استدلال کرتے ہیں ان کی بات معتبر نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جو پہلے سے اللہ کے علم میں تھی اور جس کی تعظیم آدم سے ابراہیمؑ تک تمام انبیاء کرتے آئے تھے۔ (۱)

لیکن قرآن کے بعض اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر پہلے ہو چکی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے پہلے کی بنیادوں پر عمارت کھڑی کی۔ حضرت ابراہیمؑ کو حج کی منادی کرنے کا حکم دینے کے ساتھ اس کی جو مصالح بیان کی گئیں ان میں یہ بھی ہے:

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ○ (الحج: ۲۹)

اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔

''قدیم گھر'' سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ پہلے سے قائم تھا۔ اس کی نئی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ ط

(البقرہ: ۱۲۷)

اور یاد کرو ابراہیمؑ اور اسماعیل جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔

اس سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ بنیاد پہلے سے موجود تھی، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا اور اس پر عمارت تعمیر کی۔ (۲)

قدیم تاریخ کی بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ سے قبل متعدد بار ہو چکی تھی:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کے نیچے ایک گھر بنایا تھا۔ اسے 'بیت معمور' کہتے ہیں۔ فرشتے اس کا طواف کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس جیسا ایک گھر زمین پر بھی بنائیں، تاکہ اہل زمین اسے مرکز عبادت بنالیں۔ فرشتوں نے اس حکم الٰہی کی تعمیل کی۔

(۱) البدایۃ والنہایۃ۔ ابن کثیر، ۱/۱۵۳

(۲) دیکھیے سیرت النبی۔ جلد پنجم۔ سید سلیمان ندوی۔ ص ۲۵۱-۲۵۲

۲۔ جب حضرت آدمؑ جنت سے دنیا میں بھیجے گئے تو انھوں نے اس کی تجدید کی۔ ممکن ہے پہلی تعمیر کے نشانات مٹ گئے ہوں۔ چنانچہ حضرت جبریل کی نشان دہی پر انھوں نے از سر نو اس کی تعمیر کی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ نے فرشتوں کے ساتھ مل کر بیک وقت اس کی تعمیر کی تھی۔

۳۔ حضرت آدم کی وفات کے بعد حضرت شیث اور ان کے بیٹوں نے اس کی پختہ تعمیر کی۔ عرصے تک اس کی عمارت قائم رہی اور جائے عبادت بنی رہی۔ یہاں تک کہ طوفان نوح میں وہ زمیں بوس ہوگئی اور اس کے نشانات مٹ گئے تھے۔ (۱)

حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر از سر نو اس کی تعمیر کی۔

تعمیرِ ابراہیمی

صحیح بخاری میں تعمیر ابراہیمی کی کچھ تفصیل مذکور ہے۔ اس میں ہے:

''حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ انھیں اس حال میں پایا کہ وہ زمزم کے پاس ایک درخت کے نیچے تیر درست کر رہے تھے۔ انھوں نے مخاطب کیا: اے اسماعیل! تمہارے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں یہاں اس کے لیے ایک گھر تعمیر کروں (یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک اونچے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا) حضرت اسماعیلؑ نے جواب دیا: اس پر عمل کیجئے۔ انھوں نے فرمایا: اس نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ تم اس کام میں میرا ساتھ دو۔ حضرت اسماعیلؑ نے فوراً کہا: میں تیار ہوں دونوں گھر کی تعمیر میں لگ گئے۔ اسماعیلؑ پتھر اٹھا اٹھا کر دیتے تھے اور ابراہیمؑ دیوار چنتے تھے۔ جب دیواریں کچھ بلند ہوگئیں اور حضرت ابراہیمؑ کو پتھر وہاں تک پہنچانے میں دشواری ہونے لگی تو انھوں نے ایک پتھر دیوار کے کنارے رکھا اور اس پر کھڑے ہو کر کام انجام دینے لگے۔ (یہ پتھر مقام ابراہیمؑ کے نام سے مشہور ہوا)۔ (۲)

اس گھر کی تعمیر کے دوران میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے دل اطاعت الٰہی کے جذبے سے سرشار تھے۔ جب وہ اس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انھوں نے بارگاہ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے کہ بار الٰہا دیکھنے میں تو یہ معمولی سا گھروندا ہے۔ لیکن تو چاہے تو

---

(۱) اخبار مکۃ۔ ازرقی۔ ۱/۳-۵

(۲) صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا

اسے قبولیت کا شرف عطا کر سکتا ہے۔ تیری قدرت سے بعید نہیں کہ تو اسے رہتی دنیا تک کے لوگوں کے لیے جائے پناہ اور مرکز امن وامان بنا دے:

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○ (البقرہ:۱۲۷-۱۲۸)

اور یاد کرو ابراہیمؑ اور اسماعیل جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے، تو دعا کرتے جاتے تھے "اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے۔ تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرماں) بنا، ہماری نسل سے ایک قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اس وقت تک مکے میں زیادہ آبادی نہیں تھی۔ وہاں کی زمین بے آب وگیاہ اور بنجر تھی۔ سبزہ اگتا تھا، نہ پیداوار ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس موقعے پر یہ بھی دعا کی کہ بارالٰہا لوگوں کے دل یہاں کے مکینوں کی طرف مائل کر دے اور یہاں وسائل رزق کی فراوانی کر دے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ○ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ کَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ○ (البقرہ:۱۲۵-۱۲۶)

اور (یاد کرو) کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیمؑ جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اس مقام کو مستقل جائے نماز بنا لو اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔ اور یہ کہ ابراہیمؑ نے دعا کی "اے رب اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور

آخرت کو مانیں، انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے" جواب میں اس کے رب نے فرمایا "اور جو نہ مانے گا، دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا، مگر آخر کار اسے عذاب جہنم کی طرف گھسیٹوں گا۔ اور یہ بدترین ٹھکانہ ہے۔

سورۂ ابراہیمؑ میں ہے:

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ ○ (ابراھیم:۳۷)

پروردگار۔ میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار، یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے۔ شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کو شرف قبول سے نوازا۔ اس نے حرم کو مرکز امن بنا دیا اور وہاں وسائل رزق کی فراوانی کر دی۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ وہاں کسی طرح کی پیداوار نہیں ہوتی، ہر قسم کے پھلوں کی وہاں ہر زمانے میں بہتات رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا فضل خاص قرار دیا ہے:

اَوَلَمۡ نُمَکِّنۡ لَّہُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجۡبٰۤی اِلَیۡہِ ثَمَرٰتُ کُلِّ شَیۡءٍ رِّزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○ (القصص:۵۷)

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پر امن حرم کو ان کے لیے جائے قرار بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں۔ ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

حج کی منادی

اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو مرکزیت عطا کرنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں اس کا حج کرنے کے لیے عام منادی کر دیں۔ ساتھ ہی اس نے یہ خوش خبری بھی دے دی کہ لوگ اس منادی پر دیوانہ وار دوڑ پڑیں گے اور وارفتگی کے عالم میں دور دراز مقامات سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اس کی زیارت کے لیے آئیں گے۔ ارشاد فرمایا:

وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ ۙ﴿۲۷﴾ لِّیَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ وَیَذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمۡ مِّنۡۢ بَهِیۡمَةِ الۡاَنۡعَامِ ۚ فَكُلُوۡا مِنۡهَا وَاَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِیۡرَ ﴿۫۲۸﴾ ثُمَّ لۡیَقۡضُوۡا تَفَثَهُمۡ وَلۡیُوۡفُوۡا نُذُوۡرَهُمۡ وَلۡیَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَیۡتِ الۡعَتِیۡقِ ﴿۲۹﴾ (الحج:۲۷-۲۹)

اور لوگوں کو حج کے لیے اذن عام دے دو کہ وہ تمھارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں۔ تا کہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں۔ اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں۔ پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔

روایتوں میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حج کی منادی کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے عرض کیا: ''اے میرے رب! میری آواز دور تک نہیں پہنچے گی'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم منادی کرو۔ آواز پہنچانا میرا کام ہے۔'' حضرت ابراہیمؑ ایک بلند مقام پر چڑھ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اس کو اتنا بلند کر دیا کہ تمام پہاڑ اس سے پست ہو گئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر شمال، جنوب، مشرق، اور مغرب ہر سمت رخ کر کے اعلان کیا: ''لوگو، تمہارے رب نے تم پر ''بیت عتیق'' کا حج فرض کیا ہے۔ اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو'' اس وقت اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو خواہ پہاڑ ہوں یا وادی، خشکی ہو یا سمندر ان کے سامنے کر دیا۔ اور تمام انسانوں اور جنوں نے ان کی آواز سن لی۔ [1]

یہ بات حقیقت واقعہ کے طور پر چاہے درست نہ ہو لیکن استعارے کی زبان میں حرف بحرف صادق آتی ہے۔ ہزاروں سال سے لوگ جس کثرت سے اور جس جذب وشوق اور عشق و وارفتگی کے عالم میں فریضۂ حج ادا کر رہے ہیں اور ہر سال ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی منادی کی بازگشت اب بھی فضاؤں میں گونج رہی ہے اور لوگ جوق در جوق دیوانہ وار اس پر لبیک کہہ رہے ہیں۔

(۱) اخبار مکۃ۔ ازرقی۔ ۱/ ۲۸-۲۹ عن محمد بن اسحاق

خانۂ کعبہ کی تعمیر کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا کی تھی: وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا (البقرہ:۱۲۸) (ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا) اس دعا کی تکمیل کی صورت یہ ہوئی کہ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریلؑ کو بھیجا۔ انھوں نے تمام مناسک حج پر عمل کر کے دکھایا اور حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ نے ان کی رہنمائی میں تمام مناسک ادا کیے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے، حج کی منادی کرنے پر حدودِ حرم میں رہنے والے جو لوگ اکٹھا ہو گئے تھے، ان کے ساتھ انھوں نے حضرت جبریلؑ کی رہنمائی میں حج ادا کیا۔ (۱)

(۱) حوالہ سابق ۱/۲۸-۳۱

آخری ایام

حضرت ابراہیمؑ کی مستقل رہائش کنعان میں تھی جہاں وہ حضرت سارہ اور حضرت اسحاقؑ کے ساتھ رہتے تھے۔ وقتاً فوقتاً حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ سے ملاقات کرنے اور ان کے حالات معلوم کرنے کے لیے وادی مکہ جایا کرتے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ کی کنعان آمد کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

وفات حضرت سارہ

حضرت سارہ کی وفات ایک سو ستائیس سال کی عمر میں کنعان کے شہر حبرون میں ہوئی۔ بائبل کی عبارت سے مترشح ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیمؑ ان کے پاس موجود نہیں تھے:

اور ابرہام سارہ کے لیے ماتم اور نوحہ کرنے کو وہاں گیا۔ (۱)

انھوں نے حبرون میں عفرون نامی ایک شخص سے اس کا کھیت خریدا اور اس میں موجود غار میں حضرت سارہ کو دفن کیا۔

وفات حضرت ہاجرہ

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہ کی وفات حضرت اسماعیل کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد ہوگئی تھی۔ (۲)

ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ حضرت سارہ کی وفات کے بعد ایک عرصے تک زندہ رہیں۔ (۳)

(۱) کتاب پیدائش باب ۲۳:۲

(۲) صحیح بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب یزفون النسلان فی المشی

(۳) تاریخ طبری ۱/ ۳۰۸

دیگر ازواج واولاد

گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ازواج میں حضرت ہاجرہ سے اسماعیل اور حضرت سارہ سے اسحاقؑ پیدا ہوئے۔

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سارہ کی وفات کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے ایک اور خاتون سے نکاح کیا، جن کا نام قطورہ تھا۔ ان سے چھے اولادیں ہوئیں۔

زمران۔ یقسان۔ مِدان۔ مدیان۔ اسباق۔ رسوخ [(۱)]

قدیم تاریخ کی بعض کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے قطورہ کی حیات ہی میں ایک اور نکاح کیا تھا۔ ان خاتون کا نام حجون (حجور) تھا۔ ان سے پانچ اولادیں ہوئیں۔

کیسان۔ سرج۔ امیم۔ لوطان۔ ناقس [(۲)]

بائبل سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ آزاد عورتیں نہ تھیں بلکہ لونڈیاں تھیں۔ اور چونکہ لونڈیوں سے ہونے والی اولادیں وراثت میں حق دار نہ ہوتی تھیں، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے انہیں اپنی زندگی ہی میں کچھ دے کر دوسرے علاقوں میں آباد کر دیا تھا:

> ’’اور ابرہام نے اپنا سب کچھ اضحاق کو دیا۔ اور اپنی حرموں کے بیٹوں کو ابرہام نے بہت کچھ انعام دے کر اپنے جیتے جی ان کو اپنے بیٹے اضحاق کے پاس سے مشرق کی طرف یعنی مشرق کے ملک میں بھیج دیا۔‘‘ [(۳)]

وفات حضرت ابراہیمؑ

حضرت ابراہیمؑ کی وفات بائبل کے مطابق ایک سو پچھتر (۱۷۵) سال کی عمر میں ہوئی۔ اس وقت ان کے پاس حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ دونوں موجود تھے۔ انھوں نے اسی جگہ جہاں حضرت سارہ کو دفن کیا گیا تھا، ان کی بھی تدفین کی۔ [(۴)]

---

(۱) کتاب پیدائش، باب ۲۵: ۱-۲

(۲) تاریخ طبری، ۱/ ۳۱۱، البدایۃ والنہایۃ۔ ابن کثیر، ۱/ ۱۶۴

(۳) کتاب پیدائش، باب ۲۵: ۵-۶

(۴) حوالہ سابق، باب ۲۵: ۷-۱۰

باب سوم

ملّتِ ابراہیمؑ

قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی حیات طیبہ پر روشنی ڈالتے ہوئے متعدد مقامات پر ملت ابراہیمی کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے اتباع کی دعوت دی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ آلِ عمران میں ہے:

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًاؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ٥

(آل عمران:۹۵)

تم کو ابراہیمؑ حنیف کی ملت کی پیروی کرنی چاہیے اور ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔

یہود و نصاریٰ نے نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتے ہوئے الٰہی تعلیمات میں اپنی طرف سے بے بنیاد اور باطل چیزیں شامل کر لی تھیں۔ اس لئے قرآن نے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اب ہدایت یہودیت سے حاصل ہو سکتی ہے نہ عیسائیت سے۔ بلکہ ملّت ابراہیمی کی طرف رجوع اور اس کی پیروی ضروری ہے۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْاؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًاؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ٥ (البقرہ:۱۳۵)

یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ملت ابراہیمی کی پیروی کرو اور ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

سیرت ابراہیمی کے مطالعے کے وقت ان سوالات کے جوابات کی جستجو ضروری ہے کہ ملت ابراہیمی کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے اہم اور بنیادی عناصر کیا ہیں؟ حضرت ابراہیمؑ کی اصولی تعلیمات کیا تھیں؟ اور ملت ابراہیمی کے اتباع سے مراد کن چیزوں کا اتباع ہے؟

اس تفصیلی جائزے سے واضح ہوگا کہ یہود و نصاریٰ نے ملت ابراہیمی کی بنیادی تعلیمات سے انحراف کیا تھا۔ قرآن نے انھیں دعوت دی کہ وہ ملت ابراہیمی کی بے چوں و چرا پیروی کریں اور جن چیزوں کا انھوں نے بعد میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے انہیں اپنے مذہب میں داخل کر لیا ہے، انھیں ترک کر دیں۔ اس طرح قرآن کی دعوت کسی غیر معروف اور اجنبی چیز کی طرف نہیں ہے بلکہ خود ان کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کے لائے ہوئے دین اور ان کی ملت کی طرف ہے۔

ملّت کا مفہوم

لغت میں ملّت، سنت اور طریقے کے معنی میں آتا ہے۔ لسان العرب میں ہے:

قال ابو اسحاق: الملة فی اللغة سنتهم و طریقهم(۱)

ابو اسحاق کہتے ہیں: لغت میں ملت کے معنی سنت اور طریقہ کے ہیں۔

قرآن اور حدیث میں ملّت کا استعمال اصولی طور پر دین کے معنی میں ہوا ہے، خواہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ دین ہو یا تحریف شدہ یا خود انسانوں کا وضع کردہ۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے جیل کے ساتھیوں کے سامنے دعوت پیش کی تو فرمایا:

إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ○ (یوسف:۳۷)

میں نے ان لوگوں کی ملّت چھوڑ دی ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔

انھوں نے توحید و آخرت کا انکار کرنے والوں کے مذہب کو ملّت سے تعبیر کیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی اور برابر تولنے کا حکم دیا تو اس نے وارننگ دیتے ہوئے کہا:

لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ (الاعراف: ۸۸)

اے شعیب ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے نکال دیں گے، ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملّت میں واپس آنا ہوگا۔

---

(۱) لسان العرب، ۶۳۱/۱۱

اس کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا:

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ. (الاعراف: ۸۹)

ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں۔

یہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے بھی مذہب کو ملّت کہا اور حضرت شعیبؑ نے بھی اِسے، اس کے باوجود کہ وہ باطل بنیادوں پر قائم تھا، ملّت سے تعبیر کیا۔

ان سے پہلے قوم نوح، عاد، ثمود اور دوسری قومیں بھی اپنے پیغمبروں سے کہہ چکی تھیں:

لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا. (ابراھیم: ۱۳)

ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے ورنہ تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔

قرآن میں یہودیت و نصرانیت کے لئے بھی "ملت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی آخرالزماںؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ط

(البقرہ: ۱۲۰)

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک کہ تم ان کی ملّت کا اتباع نہ کرنے لگو۔

اصحابِ کہف کی قوم عیسائیت کی پیرو تھی۔ جب اصحاب کہف نے توحید کی صدا بلند کی اور حق کا اعلان کیا تو اس معاشرے میں ان کا رہنا دوبھر ہوگیا۔ اس وقت انھوں نے ایک غار میں پناہ لینے کا منصوبہ بنایا اور آپس میں مشورہ کرتے ہوئے اس اندیشہ کا اظہار کیا:

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ.

(الکھف: ۲۰)

اگر کہیں ان لوگوں کا ہاتھ تم پر پڑ گیا تو بس سنگ سار ہی کر ڈالیں گے یا پھر زبردستی تمہیں اپنی ملّت میں واپس لے جائیں گے۔

جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی صدا بلند کی تو آپ کی قوم نے بڑے ہی استکبار سے کہا تھا:

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ صلے اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ o صلے

(ص: ۷)

یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ تو صرف ایک من گھڑت بات ہے

اس آیت میں 'ملت آخرۃ' سے کیا مراد ہے؟ اس میں کچھ اختلاف ہے۔ ابن جریر طبری نے حضرت ابن عباس، قرطبی اور سدی سے نقل کیا ہے کہ 'ملت آخرۃ' سے مراد نصرانیت ہے۔ جب کہ مجاہد اور قتادہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد قریش کا مذہب ہے[1] بہر حال دونوں میں تحریف واقع ہوگئی تھی اور باطل عقائد و نظریات شامل ہوگئے تھے۔

اسی طرح ملت کا اطلاق اسلام پر بھی کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

لایتوارث اهل ملتین[2]

دو اشخاص جو الگ الگ ملت کی پیروی کرنے والے ہوں، ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

دوسری حدیث سے اسی کی تشریح ہوتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا:

'لایرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم.'[3]

مسلمان اور کافر دونوں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

معلوم ہوا کہ ملت کا اطلاق اسلام پر بھی ہوتا ہے اور غیر اسلام (کفر) پر بھی۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من حَلَفَ بملة غير الاسلام كاذبا معتمدًا فهو كما قال.[4]

جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسری ملت کی قسم کھائے اور جان بوجھ کر کذب بیانی کرے تو وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملت کا اطلاق اسلام اور غیر اسلام دونوں پر ہوتا ہے

ایک حدیث میں ہے:

---

(۱) تفسیر طبری، جز ۲۳، ص ۸۰

(۲) جامع ترمذی، کتاب الفرائض، باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والکافر

(۳) ایضاً

(۴) صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی قاتل النفس

کل مولود یولد علیٰ ھذہ الملة.[1]

ہر بچہ اسی ملّت پر پیدا ہوتا ہے۔

اس حدیث میں ملّت سے مراد اسلام (فطرتِ الٰہی) ہے۔

ملّت کا اطلاق ایک مذہب کے مختلف فرقوں پر بھی کیا گیا ہے۔ مشہور حدیث ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة، وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلّھم فی النار الاملة واحدة، قالوا من ھی یا رسول اللہ؟ قال ما أنا علیہ واصحابی.[2]

بنی اسرائیل بہتر (۷۲) ملتوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر (۷۳) ملتوں میں بٹ جائے گی لیکن سوائے ایک ملت کے سب جہنمی ہوں گے، صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ وہ کون سی ملّت ہوگی؟ فرمایا وہ جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقے پر قائم ہوگی۔

ایک دوسری روایت میں جسے ترمذی ہی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے ملّت کی جگہ فرقہ کا لفظ آیا ہے[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں ملّت کا استعمال فرقہ کے معنی میں ہوا ہے۔

راغب اصفہانی نے لکھا ہے۔

الملة (کالدین) وھو اسم لما شرع اللہ تعالیٰ لعبادہ علی لسان الانبیاء لیتوسلوا بہ الی جوار اللہ.[4]

دین کی طرح ملت بھی اس دستورِ الٰہی کا نام ہے جو اللہ اپنے بندوں کے لئے جاری فرماتا ہے، تاکہ اس پر چل کر انسان قربِ الٰہی حاصل کر سکے اور یہ دستور انبیاء کی وساطت سے بندوں تک پہنچتا ہے۔

---

(۱) جامع ترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء کل مولود یولد علی الفطرۃ

(۲) جامع ترمذی، کتاب الایمان، باب افتراق ھذہ الامۃ۔ یہ روایت ابوداؤد، دارمی اور مسند احمد میں بھی مروی ہے۔ ترمذی نے کہا ہے ھذا حدیث حسن غریب۔

(۳) ترمذی، ایضاً

(۴) مفردات اصفہانی ص ۴۷۱

امام راغب کا یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ پیچھے گزر چکا ہے کہ ملت کا اطلاق باطل مذہب پر بھی ہوتا ہے۔ ان کے اس قول کی تاویل مولانا سید عبدالدائم جلالی نے یہ کی ہے:

''شاید راغب کی مراد یہ ہو کہ ملت اصل میں تو دستور الٰہی کا ہی نام ہے، جو انبیاء کی معرفت بھیجا جاتا ہے۔ لیکن اگر انسانی دماغ کبھی اس میں خورد برد کر لیں اور بگاڑ دیں تب بھی بطور مجاز اس پر لفظ ملت کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خورد برد کرنے والوں کے دعوے میں تو شکستہ بریدہ دین یا دستور بھی اللہ کا بھیجا ہوا دین ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔''(۱)

راغب اصفہانی نے ملت اور دین کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے: لفظ ملت کی اضافت صرف کسی نبی کی طرف ہوتی ہے۔ اس کی نسبت نہ اللہ کی طرف ہوتی ہے اور نہ نبی کی امت کے کسی فرد کی طرف''(۲)

یہ بات بھی صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اوپر مذکور متعدد آیات میں ملت کی اضافت غیر انبیاء کی طرف موجود ہے۔ مشہور حدیث ہے کہ جناب ابوطالب کے مرض وفات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہاں مشہور سرداران مکہ ابوجہل، عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ وغیرہ بھی موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا: چچا جان! آپ لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجئے تا کہ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کے لئے محاجہ کر سکوں۔ ان دونوں نے کہا: اترغب عن ملة عبدالمطلب؟ (کیا آپ عبدالمطلب کی ملت سے روگردانی اختیار کریں گے؟) یہاں تک کہ جو آخری جملہ ابوطالب کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا: علی ملة عبد المطلب(۳) (میں عبدالمطلب کی ملت پر ہوں) اس حدیث میں بھی ملت کی اضافت غیر نبی کی طرف کی گئی ہے۔

راغب کے اس قول کی تاویل بھی مولانا عبدالدائم جلالی مصنف لغات القرآن نے یہ کی ہے: لفظ ملت کی انبیاء کے ساتھ تخصیص بھی امام کے اس نظریہ پر مبنی ہے کہ ملت صرف دستور الٰہی کا نام ہے جو انبیاء کی معرفت بھیجا جاتا ہے، ورنہ غیر انبیاء کی طرف اضافت خود سورہ یوسف آیت ۳۷ میں موجود ہے''(۴)

(۱) لغات القرآن۔ جلد پنجم۔ مولانا سید عبدالدائم جلالی۔ ص ۴۳۹-۴۴۰

(۲) مفردات اصفہانی ص ۴۷۱

(۳) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ قصص، باب قولہ انك لا تهدي من احببته اور کتاب الجنائز، باب اذا قال المشرک عند الموت لا الٰہ الا اللہ

(۴) لغات القرآن ۵/۴۴۰

راغب اصفہانی نے ملت کے اشتقاق کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

واصل الملة من امللت الکتاب، قال تعالٰی (فلیملل الذی علیه الحق... فان کان الذی علیه الحق سفیھا اوضعیفااولا یستطیع ان یملّ فلیملل ولیه) وتقال الملة اعتبارًا بالشیء الذی شرعه الله (۱)

ملت کی اصل 'امللت الکتاب' سے ہے، جس کے معنی ہیں تحریر لکھوانا۔ ارشاد باری ہے ''لکھوائے وہ شخص جس پر حق آتا ہے یعنی قرض لینے والا...لیکن اگر قرض لینے والا نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے'' اور ملت اس چیز کے اعتبار سے کہا جاتا ہے جسے اللہ تعالٰی نے مشروع کیا ہے۔

لسان العرب میں ہے:

الملة:الدین کلمة الاسلام والنصرانیة والیھودیة، وقیل ھی معظم الدین وجملة مایجی به الرسل (۲)

ملت سے مراد دین ہے مثلاً اسلام، نصرانیت اور یہودیت۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دین کا بڑا حصہ اور پیغمبروں کی لائی ہوئی تعلیمات ہیں۔

اگرچہ بعض احادیث میں ملت کی اضافت رسول اللہ ﷺ کی جانب بھی کی گئی ہے۔(۳) لیکن قرآن نے انبیاء میں سے صرف حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس کی نسبت کی ہے۔ اس نے ملت ابراہیمی کو سیدھا دین قرار دیا ہے (الانعام:۱۶۱) لوگوں کو اس کے اتباع کی دعوت دی ہے (آل عمران:۹۵، الحج:۷۸) اس کا اتباع کرنے والوں کو بہترین دین کا پیرو (النساء:۱۲۵) اور اس سے اعراض کرنے والے کو بے وقوف اور نادان قرار دیا ہے (البقرہ:۱۲۵) حضرت یوسفؑ اپنے آباء حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی ملت کے اتباع پر فخر کرتے

---

(۱) مفردات اصفہانی ص۴۷۲

(۲) لسان العرب ۱۱/۶۳۱

(۳) مثلاً حضرت ابن عمرؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اذادخل المیت القبر قال بسم الله وعلی ملة رسول الله (جب میت کو قبر میں داخل کیا جائے تو کہے: اللہ کے نام سے اور رسول اللہ کی ملت پر) ترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء مایقول اذا ادخل المیت قبرہ۔

ہیں (یوسف:۳۸) اور رسول اللہ ﷺ کو بھی ملت ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے (النحل:۱۲۳)۔

اس تشریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ 'ملت ابراہیمی' سے مراد عقائد و شرائع پر مشتمل وہ طریقۂ زندگی ہے، جو حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لائے تھے۔

ملت ابراہیمی کے بنیادی عناصر

حضرت ابراہیمؑ ان پیغمبروں میں سے ہیں جن پر کتاب نازل ہوئی۔ قرآن نے صحف ابراہیمؑ کا تذکرہ دو مقامات پر کیا ہے (سورہ النجم اور سورۃ الاعلیٰ) اور اس کی بعض تعلیمات کا حوالہ دیا ہے۔ آج اگر صحف ابراہیمؑ دنیا میں موجود ہوتے، تو وہ آپ کی تعلیمات اور آپ کی ملت کے عناصر جاننے کا بہترین ذریعہ ہوتے۔ لیکن چونکہ وہ زمانے کے ہاتھوں نابود ہو چکے ہیں، اس لئے ملت ابراہیمی کے بارے میں ہمارے پاس معلومات کا ذریعہ صرف کتب مقدسہ ہیں۔ توریت کی کتاب پیدائش میں حضرت ابراہیمؑ کا تفصیل سے تذکرہ موجود ہے۔ اس کی دوسری کتابوں اور اناجیل میں بھی بعض اشارات ملتے ہیں۔ اگرچہ توریت و انجیل میں تحریف اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے اور خود اہل کتاب اس کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔ تاہم بہت سی باتیں ان میں حقیقت سے قریب مل جاتی ہیں، جن کی قرآن سے بھی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات اور آپ کی ملت کے عناصر کو جاننے کا سب سے مستند ذریعہ ہمارے پاس قرآن کریم ہے۔ قرآن نے آپ کی زندگی اور تعلیمات کا مفصل تذکرہ کیا ہے اور صحف ابراہیمؑ کے حوالے دیتے ہوئے ملت ابراہیمی کے ارکان و عناصر کی طرف اشارے کیے ہیں۔

ا۔ توحید

ملت ابراہیمی کا سب سے بنیادی عنصر توحید ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک ایسے معاشرہ میں پرورش پائی جو کفر و شرک اور بت پرستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف آپ کا معاشرہ ہی نہیں بلکہ تقریباً پوری دنیا شرک کی لپیٹ میں تھی۔ بابل، شام اور مصر ہر جگہ اصنام پرستی زوروں پر تھی۔ خدا کو سیکڑوں ہزاروں اصنام و اوثان میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ آپ جس خاندان میں پیدا ہوئے تھے وہ نہ صرف بت پرست تھا بلکہ اسے پروہت کا منصب بھی حاصل تھا۔ بت پرستی کے

اس ماحول کے باوجود جس میں حضرت ابراہیمؑ گھرے ہوئے تھے آپ نے بت پرستی کا انکار کیا۔ شرک سے براءت ظاہر کی اور ببانگ دہل خدا کی وحدانیت کا اعلان کیا:

اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿ۚ﴾ (الانعام: ۷۹)

میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے آسمان اور زمینوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز فرمایا تو آپ نے اپنے باپ، خاندان اور قوم کو دعوت دینی شروع کی۔ انھیں شرک اور بت پرستی سے روکا۔ مختلف طریقوں سے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ شرک کے معایب و نقائص اور برے نتائج بیان کیے اور صرف خدائے واحد کی عبادت کی طرف بلایا۔ قرآن نے مختلف سورتوں میں کہیں تفصیل اور کہیں اختصار سے آپ کی دعوت کو پیش کیا ہے[1] سورہ شعراء میں ہے:

وَاتۡلُ عَلَیۡهِمۡ نَبَاَ اِبۡرٰهِیۡمَ ۘ﴿﴾ اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡهِ وَقَوۡمِهٖ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿﴾ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰکِفِیۡنَ ﴿﴾ قَالَ هَلۡ یَسۡمَعُوۡنَکُمۡ اِذۡ تَدۡعُوۡنَ ﴿ۙ﴾ اَوۡ یَنۡفَعُوۡنَکُمۡ اَوۡ یَضُرُّوۡنَ ﴿﴾ قَالُوۡا بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ ﴿﴾ قَالَ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا کُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿ۙ﴾ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمُ الۡاَقۡدَمُوۡنَ ﴿۫ۖ﴾ فَاِنَّهُمۡ عَدُوٌّ لِّیۡۤ اِلَّا رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۙ﴾ الَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَهُوَ یَهۡدِیۡنِ ﴿ۙ﴾ وَالَّذِیۡ هُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَیَسۡقِیۡنِ ﴿ۙ﴾ وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِ ﴿۪ۙ﴾ وَالَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ﴿ۙ﴾ وَالَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿ؕ﴾

(الشعراء: ۶۹-۸۲)

اور انھیں ابراہیمؑ کا قصہ سناؤ جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: کچھ بت ہیں جن کو ہم پوجا کرتے

---

(۱) مثلاً دیکھیے: الانعام: ۷۳ و مابعد، الانبیاء: ۵۱ و مابعد، العنکبوت: ۱۶، ۱۷، الصافات: ۸۳ و مابعد الزخرف: ۲۶، ۲۷ وغیرہ

ہیں اور انہی کی خدمت میں ہم لگے رہتے ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انھیں پکارتے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ اس پر ابراہیمؑ نے کہا: کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) ان چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بجالاتے رہے۔ میرے تو یہ سب دشمن ہیں بجز ایک رب العالمین کے جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہوجاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرمادے گا۔

یہی نہیں بلکہ ایک موقعے پر بت خانہ کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے قوم کے سامنے عملاً ان کی بے بضاعتی ثابت کردی اور ان پر حجت تمام کردی۔ بعد میں جب قوم نے آپ کا رہنا دوبھر کردیا تو حکم الٰہی سے ہجرت کر کے آپ جہاں جہاں بھی گئے وہاں لوگوں کو خدائے واحد کی طرف دعوت دی اور آخر میں جب ''بے آب وگیاہ وادی'' پہنچے تو وہاں خدائے واحد کی عبادت کے لیے خانۂ کعبہ کی بنیاد اٹھائی۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ شرک سے دور رہو اور خانہ کعبہ کی تعمیر توحید کے مرکز کی حیثیت سے کرو:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝

(الحج: ٢٦)

یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی اس ہدایت کے ساتھ کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

حضرت ابراہیمؑ توحید پر کتنی سختی سے قائم تھے اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ آپ نے جب اللہ تعالیٰ سے شہر مکہ کو گہوارۂ امن بنانے اور وہاں پھلوں کی بہتات کرنے کی دعا کی تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنی نعمتوں سے صرف ان لوگوں کو نواز جو تجھ پر ایمان لائیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ (البقرہ: ١٢٦)

(یاد کرو اس وقت کو) جب ابراہیمؑ نے دعا کی: اے میرے رب! اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔

قرآن نے صحف ابراہیمی کا جو حوالہ دیا ہے اس میں بھی توحید پر بہت زور دیا گیا ہے۔ سورۂ نجم میں ہے:

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰیۙ وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤیۙ

(النجم:۳۶-۳۷)

کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیمؑ کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰیۙ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْیَاۙ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰیۙ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰی۪ وَاَنَّ عَلَیْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰیۙ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰیۙ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰیۙ

(النجم:۴۳-۴۹)

یہ کہ اسی نے ہنسایا اور اسی نے رلایا، اور یہ کہ اسی نے موت دی اور اسی نے زندگی بخشی، اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا، ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے، اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اسی کے ذمہ ہے، اور یہ کہ اس نے غنی کیا اور جائیداد بخشی، اور یہ کہ وہی شعریٰ کا رب ہے۔

ملت ابراہیمی میں توحید کی اہمیت اور اس کے اعلیٰ مقام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل کے ساتھیوں کے سامنے جب حق کی دعوت پیش کی تو شرک کے معایب اور نقائص بیان کرتے ہوئے، اس کے بالمقابل ملت ابراہیمی کا حوالہ دیا اور عقلی انداز میں ان کے سامنے عقیدۂ توحید پیش کیا:

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف:۳۷-۴۰)

میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی ملت کی پیروی کی ہے، ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

۲۔ رسالت

حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات میں رسالت کا بہت واضح تصور موجود ہے۔ وہ اپنے باپ اور قوم کو دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوتا ہے۔ اسے خصوصی علم سے نوازا جاتا ہے، جس سے دوسرے لوگ محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے ہدایت سے فیض یاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام نبی لے کر آئے انھیں قبول کر کے ان پر عمل کیا جائے اور نبی کی پیروی کی جائے۔ انھوں نے بعثت کے بعد جب اپنے باپ کو راہِ حق کی دعوت دی اور اس کے سامنے بت پرستی کے نقائص و معایب واضح کیے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ (مریم:۴۳)

ابا جان میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

نبی جب دعوت دیتا ہے اور مخاطبین کو ہدایت کی طرف بلاتا ہے تو وہ اپنی دعوت پر گواہ بھی ہوتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ عبادت کے لائق صرف ایک ہی ذات ہے، جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور جو سب کو روزی بہم پہنچا رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور بت پرستی پر کاری ضرب لگائی تو وہ بوکھلا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ابراہیمؑ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ سنجیدہ باتیں ہیں، یا محض کوئی کھیل تماشہ ہے؟ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا:

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ○ (الانبیاء: ۵۶)

اس نے جواب دیا: نہیں بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔

لیکن نبی کسی کو ہدایت قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کا کام بس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذمہ تبلیغ وحی کا جو فریضہ عائد کیا ہے، اسے بے کم و کاست پہنچا دے۔ اب اگر کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو خود اسی کا فائدہ ہے اور اگر کوئی انکار کرتا ہے تو اس کی سزا اسی کو بھگتنی ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو جب توحید، عبادت الٰہی اور تقوے کے فائدے اور شرک اور بت پرستی کے نقصانات بتائے تو ساتھ ہی اس سے بھی خبردار کیا:

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ○ (العنکبوت: ۱۸)

اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۳۔ آخرت

آخرت پر ایمان ملت ابراہیمی کے اہم عناصر میں سے ہے۔ عموماً اس کا ذکر ایمان باللہ اور ایمان بالرسالہ کے ساتھ آتا ہے۔ بعثت کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو دعوت

دیتے ہوئے انتہائی نرمی اور دل سوزی کے ساتھ جہاں اللہ پر ایمان لانے اور انھیں اس کا پیغمبر ماننے کی دعوت دی، وہیں ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

يَٰٓأَبَتِ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ ٱلرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَٰنِ وَلِيًّا ۝ (مریم:۴۵)

ابا جان مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔

اپنے باپ اور اپنی قوم کو دعوت دیتے ہوئے انھیں شرک کے انجام سے ڈراتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر انھوں نے بت پرستی ترک نہ کی تو انھیں آخرت میں اپنے انجام سے ڈرنا چاہیے جب اللہ تعالیٰ انھیں اس کی سزا دے گا اور عذاب میں مبتلا کرے گا:

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِۦ مَاذَا تَعْبُدُونَ ۝ أَئِفْكًا ءَالِهَةً دُونَ ٱللَّهِ تُرِيدُونَ ۝ فَمَا ظَنُّكُم بِرَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝ (الصافات:۸۵-۸۷)

جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟

اپنے عقیدے کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ اور اس کی صفات پر ایمان کے ساتھ آخرت پر ایمان کا بھی تذکرہ کرتے ہیں:

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيٓ إِلَّا رَبَّ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝ (الشعراء:۷۷)

میرے تو یہ سب دشمن ہیں۔ بجز ایک رب العالمین کے۔

وَٱلَّذِيٓ أَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لِي خَطِيٓـَٔتِي يَوْمَ ٱلدِّينِ ۝ (الشعراء:۸۲)

اس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دے گا۔

اپنی قوم کو بت پرستی کے انجام سے باخبر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

إِنَّمَا ٱتَّخَذْتُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ أَوْثَٰنًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۖ ثُمَّ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَىٰكُمُ ٱلنَّارُ وَمَا لَكُم مِّن نَّٰصِرِينَ ۝ (العنکبوت:۲۵)

تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر

قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے اور آگ تمہارا ٹھکانہ ہو گی اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔

مزید فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ ۖ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○ (العنکبوت:۱۷)

درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔

حضرت ابراہیمؑ نے جب بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ اے میرے رب! اس بے آب و گیاہ وادی کو پر امن شہر بنا دے اور یہاں رہنے والوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما، تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنی ان نعمتوں سے صرف انھیں لوگوں کو بہرہ ور فرما جو تجھ پر ایمان لائیں اور ساتھ ہی آخرت پر ایمان رکھیں:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ (البقرۃ:۱۲۶)

یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے دعا کی: اے میرے رب! اس کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔

آخرت کا تصور صحف ابراہیمی کی ان تعلیمات میں بھی ملتا ہے، جن کا قرآن نے حوالہ دیا ہے:

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ○ إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ○ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ○

(الاعلیٰ:۱۶-۱۹)

مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی۔ ابراہیمؑ اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۙ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰىٓ ۙ
(النجم:٣٦، ٣٧) وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۙ (النجم:٤٢) وَاَنَّ
عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ۙ (النجم:٤٧)

کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیمؑ کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا..... یہ کہ آخر کار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے..... اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اسی کے ذمہ ہے۔

یہی نہیں بلکہ صحف ابراہیمؑ میں تصور آخرت کے ساتھ جزا و سزا کی بھی صراحت ملتی ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۙ
ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۙ (النجم:٣٩-٤١)

اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی۔ پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی۔

۴۔ نماز

مکے کی بے آب و گیاہ وادی میں حضرت اسماعیلؑ کو آباد کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے اپنی نسل کو وہاں آباد کرنے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ وہاں رہ کر وہ نماز قائم کریں:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ
بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ. (ابراهيم:٣٧)

پروردگار! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔

اس سے ملت ابراہیمی میں نماز کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

پھر جب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی، اس وقت اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ طواف و عبادت کی غرض سے آنے والوں کے لیے اس کی طہارت کا اہتمام کریں:

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝ (البقرہ:۱۲۵)

ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝ (الحج:۲۶)

یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت ابراہیمی میں نماز کو نہ صرف بنیادی اہمیت حاصل تھی بلکہ اس کے ارکان میں قیام، رکوع اور سجود بھی شامل تھے۔

قرآن نے صحف ابراہیمؑ کی جن تعلیمات کا حوالہ دیا ہے ان میں نماز بھی ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى۝ (الاعلیٰ:۱۴،۱۵)

..... اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى۝ (الاعلیٰ:۱۸،۱۹)

فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ اور اپنے رب کا نام یاد کیا اور پھر نماز پڑھی.... یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی، ابراہیمؑ اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

چنانچہ قرآن نے اہل ایمان کو رکوع و سجود کرنے، نماز قائم کرنے اور عبادت کرنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی ملت کے ارکان ہیں:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ (البقرہ:۱۲۵)

(اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ) ابراہیمؑ جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کو مستقل جائے نماز بنا لو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ

جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ (الحج:۷۷،۷۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع اور سجدہ کرو۔ اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو۔ اسی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر۔

۵۔ قربانی

حضرت ابراہیمؑ کی حیات طیبہ میں قربانی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ توریت میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سفر کرتے ہوئے جہاں بھی پڑاؤ ڈالتے تھے وہاں خدا سے دعا کرتے اور قربان گاہ بناتے تھے۔ دعا کرنے سے عبادت الٰہی یعنی نماز اور قربان گاہ بنانے سے قربانی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کتاب پیدائش میں حضرت ابراہیمؑ کے کئی مقامات پر قربان گاہ بنانے کا تذکرہ ملتا ہے:

۱۔ ابرام مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا۔ اس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے۔ تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اسے دکھائی دیا تھا ایک قربان گاہ بنائی" (۱)

۲۔ اور وہاں سے کوچ کر کے اس پہاڑی کی طرف گیا جو بیت ایل کے مشرق میں ہے اور اپنا ڈیرہ ایسے لگایا کہ بیت ایل مغرب میں اور عی مشرق میں پڑا اور وہاں اس نے خداوند کے لیے قربان گاہ بنائی اور خداوند سے دعا کی" (۲)

(مصر سے واپسی پر) "کنعان کے جنوب سے سفر کرتا ہوا بیت ایل میں اس جگہ پہنچا جہاں پہلے بیت ایل اور عی کے درمیان اس کا ڈیرہ تھا، یعنی وہ مقام جہاں اس نے شروع میں قربان گاہ بنائی تھی اور وہاں ابرام نے خداوند سے دعا کی" (۳)

۳۔ "ابرام نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور ممرے کے بلوطوں میں جو حبرون میں ہیں، جا کر رہنے لگا اور وہاں خداوند کے لیے ایک قربان گاہ بنائی" (۴)

(۱) کتاب پیدائش باب ۱۲: ۶-۷

(۲) ایضاً باب ۱۲: ۸

(۳) ایضاً باب ۱۳: ۳-۴

(۴) ایضاً باب ۱۳: ۱۸

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیمؑ کو حج کا اعلانِ عام کرنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ○ (الحج:۲۸)

تاکہ وہ لوگ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں اور چند مقررہ دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں بخشے ہیں۔ خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی ایک بہت بڑی آزمائش کی۔ اور وہ یہ کہ انھیں کو حکم دیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو میری راہ میں قربان کر دو۔ یہ ایک شدید آزمائش تھی لیکن عاشق صادق اس میں بھی کامیاب ہو گیا اور بے چون وچرا ارشادِ الٰہی کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔ بالآخر ندائے غیبی آئی کہ مقصود صرف آزمائش تھی، اس لیے اب ہاتھ روک لو۔ توریت میں واقعۂ ذبح کا تفصیلی بیان موجود ہے[1] قرآن نے بھی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے رہتی دنیا تک کے لیے یادگار قرار دیے جانے کا تذکرہ کیا ہے:

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ○ وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ○ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ○ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ○ (الصّٰفّٰت: ۱۰۳-۱۰۷)

جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیمؑ تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔

توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت آدمؑ[2] کی طرح شریعت ابراہیمی میں بھی پہلوٹھے کی قربانی کی جاتی تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو پہلوٹھے بیٹے کو قربانی کا حکم دیا تھا۔

(۱) کتاب پیدائش باب ۲۲: ۱-۱۹

(۲) کتاب پیدائش باب ۴: ۴ میں ہے: ''اور ہابل بھی اپنے بھیڑ بکروں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیے کو منظور کر لیا۔''

۶۔ حج

شریعت ابراہیمی کا ایک اہم رکن حج ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی جگہ، خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور دعا کی کہ وہ انھیں ادائے مناسک کا طریقہ بتا دے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّاؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَاۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (البقرہ:۱۲۷۔۱۲۸)

اور یاد کرو، ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے (تو دعا کرتے جاتے تھے) اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے۔ تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبول سے نوازا اور مناسک حج بتائے۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ وہ لوگوں میں حج کا اعلان کر دیں تا کہ ان کے ماننے والے دنیا کے کونے کونے سے کھنچ کر بیت اللہ کی زیارت کو آئیں اور مناسک حج ادا کریں۔

وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ (الحج:۲۷)

اور لوگوں کو حج کے لیے اذن عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں۔

۷۔ ختنہ

ملت ابراہیمی کا ایک شعار ختنہ ہے۔ توریت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے کثرت ذریت کا وعدہ کیا اور یہ عہد لیا کہ اگر ان کی نسل توحید پر قائم رہی تو انھیں زمین پر اقتدار عطا کرے گا۔ اس عہد کو یاد دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ختنہ کو اس کی علامت قرار دیا:

"پھر خدا نے ابرہام سے کہا کہ تو میرے عہد کو ماننا اور تیرے بعد تیری نسل پشت

در پشت اسے مانتے اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلوی کا ختنہ کیا کرنا اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔(۱)

ملت ابراہیمی میں ختنے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ توریت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے کیونکہ اس نے میرا عہد توڑا۔(۲)

چنانچہ یہ حکم ملتے ہی حضرت ابراہیمؑ نے گھر کے سب لوگوں کو جمع کیا اور اسی روز ان کا ختنہ کیا۔ ان میں حضرت اسماعیلؑ بھی تھے۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ننانوے سال اور حضرت اسماعیلؑ کی تیرہ سال تھی۔(۳) پھر اگلے سال جب حضرت اسحاقؑ کی ولادت ہوئی تو حضرت ابراہیمؑ نے ان کا بھی ختنہ کیا۔(۴)

حدیث میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے ختنہ کرنے کا تذکرہ ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اختتن ابراهيم وهو ابن ثمانين سنة بالقدوم (۵)

حضرت ابراہیمؑ نے اسّی سال کی عمر میں قدومؔ (ایک اوزار) سے ختنہ کیا۔

موطأ میں حضرت ابوہریرہؓ سے موقوفاً اور ابن حبان میں مرفوعاً مروی ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ ابن حجر نے فتح الباری میں دونوں قسم کی روایتوں میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔(۶) بہرحال ختنہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر کچھ بھی رہی ہو مگر اس کا ثبوت توریت اور حدیث دونوں میں موجود ہے۔

---

(۱) کتاب پیدائش باب ۱۷: ۹-۱۱

(۲) کتاب پیدائش، باب ۱۷: ۱۴

(۳) ایضاً باب ۱۷: ۲۳-۲۷

(۴) ایضاً باب ۲۱: ۴

(۵) صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قولہ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا

(۶) فتح الباری۔ ابن حجر عسقلانی، ۶/ ۲۲۵

۸۔ انفرادی ذمے داری

ملت ابراہیمی کا ایک اہم عنصر یہ عقیدہ ہے کہ ہر شخص اپنے کاموں کا آپ ذمے دار ہے۔ جو جیسا کرے گا، اسے اسی کے مطابق بدلہ ملے گا۔ اگر اس کے کام اچھے ہوں گے تو وہ اجر کا مستحق ہوگا لیکن اگر بدعملی کا مرتکب ہوا ہوگا تو اسے اس کے مطابق سزا ملے گی۔ نہ کوئی شخص پیدائشی گناہ گار ہے اور نہ کوئی دوسرے کے گناہوں کو بخشوا سکتا ہے۔ قرآن نے صحف ابراہیمؑ کی جن تعلیمات کا حوالہ دیا ہے، ان میں سب سے پہلے اسی عقیدے کو بیان کیا گیا ہے:

اَمْ لَمْ یُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰیۙ وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤیۙ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰیۙ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰیۙ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰیۙ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰیۙ

(النجم: ۳۶-۴۱)

کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا؟ یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰیۙ وَذَكَرَاسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰیؕ (الاعلیٰ: ۱۴)...
اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰیۙ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰیؑ

(الاعلیٰ: ۱۹)

فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی......
یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی۔ ابراہیمؑ اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ملتِ ابراہیمی کے حاملین

حضرت ابراہیمؑ جو دین لے کر آئے تھے اسے نہ صرف یہ کہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک انجام دیتے رہے بلکہ آپ نے اپنی اولاد کو بھی اس کے لیے تیار کیا کہ وہ ان کے بعد اس مشن کو جاری رکھ سکیں اور تشنگانِ حق و صداقت کی پیاس بجھا سکیں۔ آپ کی کوششوں سے دعوت توحید کو

ایسی نمایاں اور امتیازی حیثیت مل گئی کہ آپ کے بعد بھی جو چاہے اس کی طرف رجوع ہو سکے اور اس کے سایۂ عاطفت میں جگہ پا سکے۔ ارشاد باری ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ ۝ إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ ۝ وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (الزخرف:۲۶-۲۸)

یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ تم جن کی بندگی کرتے ہو میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا تعلق صرف اس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ وہی میری رہنمائی کرے گا۔ اور ابراہیمؑ یہی کلمہ اپنے بعد کے لوگوں میں چھوڑ گیا تا کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے درمیان توحید کا اعلان کیا اور شرک سے براءت ظاہر کی۔ انھوں نے اپنے قول و عمل اور تعلیم و تذکیر سے اپنے اس اعلان براءت کو ایک پائیدار روایت کی حیثیت دے دی تا کہ بعد کے لوگوں کے قدم جب بھی راہ راست سے ذرا ہٹیں، یہ کلمہ ان کی رہنمائی کے لیے موجود رہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو بھی صراحت سے تاکید کی کہ وہ اللہ کے دین پر قائم رہیں اور جیتے جی اس سے سرِ مو انحراف نہ کریں۔

وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ (البقرہ:۱۳۲)

اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوبؑ اپنی اولاد کو کر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میرے بچو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے، لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی کس وصیت کی طرف اشارہ ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین سے دو اقوال منقول ہیں: ایک یہ کہ گزشتہ آیت (البقرہ:۱۳۱) میں یہ مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ ''مسلم ہو جا'' تو انھوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو بھی ایسے ہی اخلاص اور مکمل اطاعت و سرافگندگی کا حکم دیا تھا۔ آیت میں ضمیر (ھا) کا مرجع کوئی متعین لفظ نہیں بلکہ پوری بات ہے۔ دوسرا قول یہ ہے

کہ گزشتہ سے پیوستہ آیت (البقرہ:۱۳۰) میں 'ملت ابراہیمؑ' کا تذکرہ ہے۔ 'ھا' کی ضمیر اسی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو اپنی ملت کے اتباع کا حکم دیا تھا۔(۱)

حضرت ابراہیمؑ کے بعد آپ کی ذریت نے بھی اس امانت کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ وہ خود بھی توحید پر مضبوطی سے قائم رہے اور اپنی آئندہ نسلوں کو بھی اسی کی وصیت کرتے رہے۔ اس آیت (البقرہ:۱۳۲) میں صراحت ہے کہ توحید پر قائم رہنے اور صرف اللہ کے سامنے سر جھکانے کی جو وصیت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی تھی وہی وصیت ان کے پوتے حضرت یعقوبؑ نے بھی اپنی اولاد کو کی تھی۔ اس کی مزید تفصیل اگلی آیت میں مذکور ہے:

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ لا اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ط قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ج صلے وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۳۳)

پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا: میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟ ان سب نے جواب دیا: ''ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ نے خدا مانا ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں''

اس آیت سے نہ صرف یہ کہ اولادِ یعقوبؑ کے توحید پر قائم رہنے کے عزم کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ اس میں اس کی بھی صراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد ان کی اولاد- حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ -بھی اس پر قائم اور اس کی داعی رہی۔ افسوس کہ یہود کے صحیفے اس اہم تاریخی واقعہ کے تذکرہ سے خاموش ہیں۔ البتہ ان کی بعض تاریخی کتابوں میں اس کی صراحت ملتی ہے۔ گنز برگ کی 'قصص یہود' میں حضرت اسحاقؑ کے بارے میں ہے:

جب اسحاقؑ نے دیکھا کہ ان کا وقت موعود آپہنچا تو انھوں نے اپنے بیٹوں کو اپنے پاس

---

(۱) طبری اور زمخشری نے اول الذکر قول کو اختیار کیا ہے۔ تفسیر طبری ۳/۹۳-۹۴، کشاف ۱/۳۱۲، ابن کثیر، بیضاوی اور رازی وغیرہ نے دونوں اقوال ذکر کیے ہیں البتہ رازی نے قاضی (عبدالجبار) کے حوالے سے موخر الذکر قول کو راجح قرار دیا ہے اور اس کے وجوہِ ترجیح ذکر کیے ہیں۔ انھوں نے لفظ ''وصّی'' کے استعمال میں متعدد حکمتوں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ دیکھیے تفسیر ابن کثیر ۱/۱۸۵، تفسیر بیضاوی ۱/۱۰۸، تفسیر کبیر ۱/۵۱۳۔

بلایا اور کہا کہ میں تمہیں خدائے تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات علی، عظیم، قیوم، عزیز ہیں اور آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی ہر شے کا خالق ہے کہ تم خوف اسی کا رکھنا اور عبادت اسی کی کرنا(۱)

اور حضرت یعقوبؑ کے بارے میں اس میں یہ صراحت ملتی ہے:

''یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے کہا..... مجھے اندیشہ ہے کہ تم میں سے کوئی بت پرستی کا میلان رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں بارہ بیٹوں نے کہا'' سن اے اسرائیل، اے ہمارے رب، ہمارا خدا وہی خدائے لم یزل ہے۔ جس طرح تیرا دلی ایمان ایک خدا پر ہے اسی طرح ہم سب کا دلی ایمان ایک خدا پر ہے''(۲)

حضرت یعقوبؑ کے بعد ان کے صاحب زادے حضرت یوسفؑ ملت ابراہیمی کی اتباع کا اعلان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیل میں جب ان کے سامنے دو قیدیوں نے اپنے خواب بیان کر کے ان کی تعبیر جاننا چاہی تو انھیں ان کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرنے کا مناسب موقع ہاتھ آیا۔ اس وقت انھوں نے فرمایا:

اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ کٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا کَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ ۝

(یوسف: ۳۷-۳۸)

واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد ان کی ذریت ملت ابراہیمی پر عمل پیرا رہی۔ ان کے بیٹے اسحاقؑ، پوتے یعقوبؑ اور پرپوتے یوسفؑ سب اسی ملت کی اتباع کرنے والے اور اسی کی طرف دوسروں کو دعوت دینے والے تھے۔

(۱) گنز برگ۔ قصص یہود ۱/ ۴۱۶ بحوالہ عبدالماجد دریابادی۔ تفسیر قرآن (تفسیر ماجدی) ۱/ ۲۵۸

(۲) گنز برگ۔ قصص یہود ۲/ ۱۴۱ بحوالہ سابق ۱/ ۲۵۷

ملتِ ابراہیمی اور انبیائے بنی اسرائیل

بعد میں بھی جو انبیاء بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے انھوں نے توحید کی دعوت دی۔ شرک اور دیگر معصیتوں میں مبتلا ہونے سے ڈرایا اور ملت ابراہیمی اختیار کرنے کی تاکید کی۔ وہ اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلاتے یا اللہ سے دعا کرتے تو ''ابراہیمؑ اضحاق اور یعقوبؑ کا خدا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ مثلاً بائبل میں حضرت موسیٰ کے بارے میں ہے:

''پھر خدا نے موسیٰ سے یہ بھی کہا کہ تو بنی اسرائیل سے یوں کہنا کہ خداوند تمہارے باپ دادا کے خدا، ابرہام کے خدا اور اضحاق کے خدا اور یعقوبؑ کے خدا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ ابد تک میرا یہی نام ہے اور سب نسلوں میں اسی سے میرا ذکر ہوگا۔ جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر اور ان کو کہہ کہ خداوند تمہارے باپ دادا کے خدا، ابرہام اور اضحاق اور یعقوبؑ کے خدا نے مجھے دکھائی دے کر یہ کہا ہے کہ میں نے تم کو بھی اور جو کچھ برتاؤ تمہارے ساتھ مصر میں کیا جارہا ہے، اسے بھی خوب دیکھا ہے''(۱)

ایلیا نبی کی دعا یوں مذکور ہے:

''اور شام کی قربانی چڑھانے کے وقت ایلیا نبی نزدیک آیا اور اس نے کہا ''اے خداوند، ابرہام اور اضحاق اور اسرائیل کے خدا۔ آج معلوم ہو جائے کہ اسرائیل میں تو ہی خدا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں نے ان سب باتوں کو تیرے ہی حکم سے کیا ہے.....''(۲)

حضرت داؤد نے بنی اسرائیل کو یوں نصیحت فرمائی:

''اے اس کے بندے اسرائیل کی نسل۔ اے بنی یعقوبؑ جو اس کے برگزیدہ ہو، وہ خداوند ہمارا خدا ہے۔ تمام روئے زمین پر اس کے آئین ہیں۔ سدا اس کے عہد کو یاد رکھو اور ہزار پشتوں تک اس کے کلام کو جو اس نے فرمایا، اس عہد کو جو اس نے ابرہام سے باندھا اور اس قسم کو جو اس نے اضحاق سے کھائی، جسے اس نے یعقوبؑ کے لیے آئین کے طور پر اور اسرائیل کے لیے ابدی عہد کے طور پر قائم کیا.....''(۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر یہودیوں سے فرمایا جو ان کی مخالفت پر کمر بستہ اور ان کی جان کے درپے تھے:

---

(۱) کتاب خروج، باب ۳: ۱۵-۱۶

(۲) کتاب سلاطین اول، باب ۱۸: ۳۶

(۳) کتاب تواریخ اول باب ۱۶: ۱۳-۱۷

"میں جانتا ہوں کہ تم ابرہام کی نسل سے ہو تو بھی میرے قتل کی کوشش میں ہو، کیونکہ میرا کلام تمہارے دل میں جگہ نہیں پاتا۔ میں نے جو اپنے باپ کے یہاں دیکھا ہے وہ کہتا ہوں اور تم نے جو اپنے باپ سے سنا ہے وہ کرتے ہو" انھوں نے جواب میں اس سے کہا: "ہمارا باپ تو ابرہام ہے۔" یسوع نے ان سے کہا: "اگر تم ابرہام کے فرزند ہوتے تو ابرہام کے سے کام کرتے۔ لیکن اب تم مجھ جیسے شخص کے قتل کی کوشش میں ہو جس نے تم کو وہی حق بات بتائی جو خدا سے سنی۔ ابرہام نے تو یہ نہیں کیا تھا"(۱)

قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ بعد کے انبیاء کی دعوت وہی تھی جو حضرت ابراہیمؑ کی دعوت تھی:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ (۲) (آل عمران: ۸۴)

اے نبی کہو کہ "ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ اس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے۔ ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوئی تھیں اور ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کی بنیادی تعلیم ایک ہی تھی۔ جس دین کی طرف حضرت ابراہیمؑ نے دعوت دی تھی اسی کی طرف ان کے بعد آنے والے تمام انبیاء نے بھی دعوت دی۔

یہود کا ملتِ ابراہیمی سے انحراف

بنی اسرائیل ایک عرصہ تک ملت ابراہیمی پر قائم اور عمل پیرا رہے۔ ان کے عقائد صحیح اور اعمال نیک رہے۔ لیکن پھر ان میں انحرافات در آئے۔ وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے اور بداعمالیوں کا شکار ہوگئے۔ انھوں نے اپنے لیے جو شریعت ایجاد کی وہ یہودیت کہلائی اور اس پر ایمان لانے اور عمل کرنے والے یہود کہلائے۔ یہود اگرچہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے طریقے پر عمل پیرا ہیں لیکن ان کے عقائد و تصورات اور اعمال میں سے بہت سی چیزیں ملت ابراہیمی سے متصادم تھیں۔ مثلاً:

(۱) انجیل یوحنا باب ۸: ۳۷-۴۰

(۲) مزید دیکھیے النساء: ۱۶۳، الشوریٰ: ۱۳

ا۔ وہ جادۂ توحید پر قائم نہیں رہ سکے اور ہم سایہ مشرک قوموں کے اثر سے ان میں بھی شرک سرایت کر گیا۔ مظاہر پرستی کی جانب ان کے میلان کا اظہار حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں ہونے لگا تھا۔ ان کی ہم سایہ مصری قوم گائے کی پرستش کرتی تھی چنانچہ ان کے دلوں میں بھی اس سے عقیدت اور پرستش کے جذبات پروان چڑھ گئے (النسا:۱۵۳) بعد کے ادوار میں بھی وہ شرک سے بالکلیہ محفوظ نہیں رہ سکے۔ حضرت عزیرؑ جنھیں ان کی مذہبی تاریخ میں اہم مقام حاصل تھا کیونکہ انھوں نے زوال ونکبت کے دور میں ان کی اصلاح اور تجدید کا فریضہ انجام دیا تھا۔ انھوں نے انھیں ''اللہ کا بیٹا'' قرار دے دیا تھا (التوبہ:۳۰)

۲۔ انھوں نے ایمان بالرسالۃ کے تقاضے پورے نہیں کیے۔ حضرت موسیٰؑ ان کے سب سے بڑے محسن تھے، مگر ان پر بھی انھوں نے بے اعتمادی کا اظہار کیا اور متعدد مواقع پر ان کے فرمان کو بے چوں وچرا قبول کرنے کی بجائے کج بحثی کی۔ ان کے بعد آنے والے انبیاء کے ساتھ بھی ان کا معاملہ یہ رہا کہ اگر ان کی لائی ہوئی تعلیمات ان کی خواہشوں سے میل نہ کھاتیں تو انھیں جھٹلاتے۔ یہی نہیں بلکہ انھیں اللہ کے برگزیدہ بندوں کے قتل میں بھی عار نہ ہوا (البقرہ:۸۷)

۳۔ ان کے عقیدۂ آخرت میں فساد آ گیا تھا۔ انھوں نے یہ گمان کر لیا تھا کہ چونکہ وہ انبیاء کی نسل سے ہیں اس لیے اخروی زندگی میں سرخ روئی ان کا مقدر رہے، بلکہ ان میں بعض فرقے ایسے تھے جو کھلم کھلا قیامت کا انکار کرتے تھے۔

۴۔ وہ عبادات سے بے پروا ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے نمازوں کا اہتمام ترک کر دیا تھا (مریم:۵۹) اسی طرح ان میں مال ودولت کی شدید حرص پیدا ہو گئی تھی۔ دولت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لیے انھوں نے بڑے پیمانے پر سودی کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ (النسا:۱۶۱،۵۳)

۵۔ ملت ابراہیمی میں حج بیت اللہ کو بہت اہم مقام حاصل تھا۔ اس کی تعمیر میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت اسماعیلؑ بھی شریک رہے تھے۔ یہود کو چونکہ حضرت اسماعیلؑ سے خاص پرخاش تھی اور وہ ان کی عظمت کے منکر تھے، اس لیے انھوں نے پوری کوشش کی کہ اس سے حضرت ابراہیمؑ کا بھی کوئی تعلق ظاہر نہ ہونے پائے۔

توریت میں حضرت ابراہیمؑ کا مفصل تذکرہ ہے لیکن کیا کبھی وہ مکہ کی بے آب وگیاہ وادی تشریف لے گئے تھے؟ اور کیا وہاں اللہ کی عبادت کے لیے کوئی گھر تعمیر کیا تھا؟ اس کے ذکر سے وہ

خالی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قصداً اسے نظر انداز کیا گیا ہو۔ توریت میں اس سلسلے میں گو اب بھی بعض اشارات پائے جاتے ہیں، لیکن اس کے شارحین و مترجمین نے دانستہ انھیں چھپانے اور ان کو دوسرے معنی پہنانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر بائبل کی کتاب زبور میں ہے:

''مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہتے ہیں۔ وہ سدا تیری تعریف کریں گے..... وہ وادئ بکا سے گزر کر اسے چشموں کی جگہ بنا لیتے ہیں'' (۱)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مخصوص وادی کی طرف اشارہ ہے اور یہ وادی کوئی اور نہیں بلکہ وادی بکہ (مکہ) ہے جس کا تذکرہ قرآن میں سورۂ آلِ عمران آیت ۹۶ میں بھی ہے۔ لیکن بائبل کے مترجمین نے اسے بجائے علَم کے اسم نکرہ قرار دے کر اس کا ترجمہ ''رونے کی وادی'' کر ڈالا۔ (۲)

اسی طرح بائبل میں حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت کے ذکر میں ہے:

''اور ابرام اس ملک میں سے گزرتا ہوا مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا.....اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اسے دکھائی دیا تھا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے کوچ کر کے اس پہاڑ کی طرف گیا جو بیت ایل کے مشرق میں ہے'' (۳)

یہود مورہ کو بیت المقدس میں بتاتے ہیں۔ لیکن متعدد قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ مروہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور بیت ایل سے مراد بیت اللہ (خانۂ کعبہ) ہے۔ (۴)

۶۔ صحف ابراہیمی کی ایک اہم تعلیم یہ تھی کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں محض حسب ونسب کچھ کام نہ آئے گا۔ بائبل کے صحیفوں میں بھی اس پر زور دیا گیا ہے (حزقی ایل باب ۱۸: ۲۰) لیکن یہود نے یہ مفروضہ قائم کر لیا تھا کہ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی چہیتی قوم ہیں اور ان کا تعلق اس کے برگزیدہ بندوں کی نسل سے ہے اس لیے ان کے برے اعمال کا مواخذہ نہیں ہوگا یا اگر انھیں ان کی سزا ملی تو محض چند دن۔ (البقرہ: ۸۰، الاعراف: ۵۹)

نصاریٰ اور ملت ابراہیمی

یہود کی طرح نصاریٰ بھی ملت ابراہیمی سے گریزاں رہے۔ وہ بظاہر تو اس پر عمل پیرا

---

(۱) کتاب زبور ۸۴: ۴-۶ (۲) تفسیر ماجدی اول ص ۶۲۰ (۳) کتاب پیدائش باب ۱۲: ۶-۸

(۴) اس موضوع پر مولانا فراہی نے تفصیل سے لکھا ہے، ملاحظہ کیجیے ان کا کتابچہ ''آں حضرت ﷺ کا سلسلۂ نسب اور اہل کتاب'' ص ۲۰-۲۷ اور ذبیح کون ہے؟ ص ۴۴-۵۶

ہونے کا دعویٰ کرتے، لیکن حقیقت میں انھوں نے بہت سی باتیں اپنی طرف سے گھڑلی تھیں، جن کا ملت ابراہیمی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

دوسری ثقافتوں اور فلسفوں سے تاثر کے نتیجے میں نصاریٰ شرک میں ملوث ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ نے انھیں توحید خالص کی دعوت دی تھی اور خود کو اللہ کے بندے اور رسول کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ لیکن نصاریٰ نے خود ان کے معاملے میں غلو سے کام لے کر انھیں اللہ کا بیٹا، پھر ایک قدم آگے بڑھ کر الٰہ بنالیا، پھر روح القدس کو درجۂ الوہیت پر فائز کر کے ''باپ بیٹا اور روح القدس'' تینوں کی الوہیت سے مرکب تثلیث کا عقیدہ وضع کر لیا۔ ان میں سے بعض فرقوں نے روح القدس کی بجائے حضرت عیسیٰ کی ماں کو الٰہ بنالیا۔ قرآن نے اس عقیدے پر ان کی سرزنش کی:

وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ

(النساء: ۱۷۱)

اور نہ کہو کہ ''تین ہیں'' باز آجاؤ یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔

۲۔ انھوں نے یہ عقیدہ پیش کیا کہ آدم نے جنت میں ممنوعہ درخت کا پھل کھا کر جس غلطی کا ارتکاب کیا تھا، اس کی بنا پر ان سے ارادہ واختیار کی آزادی سلب کر لی گئی تھی اور وہ ابدی عذاب کے مستحق ہو گئے تھے۔ یہ غلطی تمام اولاد آدم میں منتقل ہو گئی اور وہ سب بھی اس خطائے اصلی کی سزا کے مستحق قرار پائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے ان کو اس سزا سے بچانے کے لیے اپنے ''بیٹے'' کو جسم انسانی میں دنیا میں بھیجا، جس نے صلیب پر جان دے کر تمام انسانوں کی طرف سے اس خطائے اصلی کا کفارہ ادا کر دیا۔

۳۔ ختنہ کو ملت ابراہیمی میں شعار کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ اس عہد کی علامت تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل سے باندھا تھا، لیکن نصاریٰ نے اس کی اہمیت ختم کر دی۔ گلتیوں کے نام پولس کے خط میں ہے:

''اگر تم ختنہ کراؤ گے تو مسیح سے تم کو کچھ فائدہ نہ ہوگا.... اور مسیح یسوع میں نہ تو ختنہ کچھ کام کا ہے نہ نامختونی، مگر ایمان جو محبت کی راہ سے اثر کرتا ہے'' (۱)

(۱) عہد نامہ جدید، گلتیوں، باب ۵: ۱، ۶

ملت ابراہیمی اور اسلام

قرآن نے یہود اور نصاریٰ کی گمراہیوں پر ان کی سرزنش کی، ان کے بے بنیاد دعووں کی قلعی کھول دی اور انھیں ملت ابراہیمی کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا:

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

(آلِ عمران:۹۵)

تم کو ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرنی چاہیے جو حنیف تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کو ملت ابراہیمی کی ان حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا پڑے گا، جن کی طرف آخری نبی حضرت محمد ﷺ دعوت دے رہے ہیں اور جو قرآن میں مذکور ہیں۔ نہ کہ ملت ابراہیمی کے نام پر ان مزعومات اور اوہام وخرافات سے چمٹے رہیں جو انھوں نے اپنی طرف سے گھڑ رکھی ہیں۔ (۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (البقرہ:۱۳۵)

یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو "نہیں بلکہ ابراہیمؑ کا طریقہ جو حنیف تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

اس آیت میں ملۃ ابراھیم کے الفاظ سے قبل بعض مفسرین نے نتبع اور بعض نے اتبعوا محذوف مانا ہے۔ پہلی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہود اور نصاریٰ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ہدایت صرف ان کے مذہب میں محصور ہے۔ اہل ایمان اس کا یہ جواب دیں کہ "ہم یہودیت یا نصرانیت کے بجائے ملت ابراہیمی کے پیرو ہیں۔ دوسری صورت میں آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ اہل کتاب کو یہ جواب دینے کا حکم دیا گیا کہ یہودیت یا نصرانیت اختیار کرنے سے ہدایت نہیں ملے گی، بلکہ ملت ابراہیمی کی اتباع کرو تبھی راہ یاب ہو گے۔ (۲)

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۳۸۲، تفسیر کبیر ۳/۵

(۲) تفسیر طبری ۳/۱۰۲-۱۰۳، تفسیر کبیر ۱/۵۱۸، مولانا امین احسن اصلاحی نے "اتبعوا" محذوف مانا ہے اور اس کے وجوہ ترجیح ذکر کیے ہیں۔ تدبر قرآن ۱/۳۰۳

دوسری طرف مسلمانوں پر بھی واضح کر دیا گیا کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے وہی دین مشروع کیا ہے جو اس نے اپنے پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ بھیجا تھا اور جسے پہنچانے کا حکم اس نے ان سے پہلے اور ان کے بعد آنے والے پیغمبروں کو دیا تھا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (الشوریٰ:۱۳)

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمد) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں۔

خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کو بھی بصراحت وتاکید حکم دیا گیا کہ ملت ابراہیمی کی پیروی کریں۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (النحل:۱۲۳)

پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ ابراہیمؑ کے طریقے پر چلو جو حنیف تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

آپ جس "صراط مستقیم" پر گامزن تھے اور جس دین کو لے کر تشریف لائے تھے، وہ وہی تھا جس کی طرف حضرت ابراہیمؑ نے دعوت دی تھی۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الانعام:۱۶۱)

اے نبی کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں۔ ابراہیمؑ کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

ملت ابراہیمی اور اسلام کے مابین اتحاد واشتراک کے مختلف پہلوؤں کی جانب آئندہ سطور میں اشارہ کیا جاتا ہے۔

الف۔ اسلام اور ملت ابراہیمی دونوں کی روح ایک ہے

اسلام اور استسلام عربی زبان میں ہم معنی الفاظ ہیں۔ ان کے معنی ہیں انقیاد واطاعت

خود سپردگی، اخلاص وغیرہ۔[1] اسلام کو اسلام کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس دین کو قبول کرتے ہی انسان حق کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں اللہ کی رضا کا پابند ہوتا ہے اور اس سے سرمو انحراف اس کے لیے روا نہیں ہوتا۔ اسی معنی میں یہ لفظ قرآن میں بکثرت مقامات پر آیا ہے۔[2] سورہ بقرہ میں ہے:

بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿ (البقرہ:۱۱۲)

حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے، اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا موقع نہیں ہے۔

اور ملت ابراہیمی کی روح بھی یہی اللہ کی اطاعت و فرماں برداری، اس کے لیے اخلاص اور اس کی بارگاہ میں خود سپردگی و ناصیہ فرسائی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی سے اسی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی بے چوں و چرا تعمیل کی۔ اس کا ہر فرمان بجا لائے۔ تمام آزمائشوں میں پورے اترے اور اپنی تمام خواہشوں کو رضائے الٰہی کا پابند بنا دیا تھا۔ قرآن نے اس چیز کو 'اسلام' سے تعبیر کیا ہے:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿ (البقرہ:۱۳۱)

اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا "مسلم ہو جا" تو اس نے فوراً کہا "میں مالک کائنات کا مسلم" ہو گیا۔

اطاعت اور فرماں برداری کا نقطۂ عروج وہ منظر تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اشارۂ الٰہی پاتے ہی اپنے لختِ جگر کو قربان کرنے پر تیار ہو گئے تھے اور لختِ جگر نے بھی اس کے نفاذ کے لیے خود کو حوالے کر دیا تھا۔ قرآن نے اس کی منظر کشی یوں کی ہے:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿ (الصافات:۱۰۳)

جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا۔

---

(۱) لسان العرب ۱۲/۲۹۴، المفردات ص ۲۴۰

(۲) مثلاً آل عمران: ۲۰، الانعام: ۷۱، لقمان: ۲۲، النمل: ۴۴، مومن: ۶۶ وغیرہ

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اس روشن پہلو کی طرف اشارہ کرنے کے لیے قرآن نے آپ کی ایک صفت 'مسلم' بیان کی ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ط (آلِ عمران:۶۷)

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو حنیف اور مسلم تھا۔

خانۂ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہِ الٰہی میں جو دعا کی تھی اس میں یہ بھی تھا کہ مجھے اور میری اولاد کو 'مسلم' بنا اور ہماری نسل سے ایک مسلم امت برپا کر۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص

(البقرہ:۱۲۸)

اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔

یہ حضرت ابراہیمؑ کا نجی معاملہ نہ تھا، بلکہ ان کے بعد ان کی نسل سے آنے والے پیغمبروں نے بھی اپنی امتوں کو اسی 'صراط مستقیم' کی دعوت دی اور وہ امتیں جب تک حق کی شاہراہ پر گامزن رہیں، اس زرّیں اصول کو سینے سے لگائے رہیں۔ حضرت یعقوبؑ نے زندگی کے آخری لمحات میں اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ تم لوگ مرتے دم تک مسلم ہی رہنا (البقرہ:۱۳۲) اور ان کے صاحب زادوں نے بھی کمال سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مسلم ہونے کا اظہار کیا تھا (البقرہ:۱۳۳) اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے جب اپنی قوم میں اعلان کیا کہ اللہ کی راہ میں میرا کون مددگار ہے؟ تو ان کے مخلص پیروکاروں نے جواب دیا تھا۔

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ج اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ج وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ o

(آلِ عمران:۵۲)

ہم اللہ پر ایمان لائے۔ آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے والے) ہیں۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت و فرماں برداری ملت ابراہیمی کی روح ہے اور یہی اسلام کا بھی اصل الاصول ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (البقرہ: ۲۰۸)

اے ایمان لانے والوں تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

ب۔ ملت ابراہیمی کے تمام عناصر اسلام میں باقی رکھے گئے ہیں

قرآن میں ملت ابراہیمی کی جو تفصیلات مذکور ہیں، ان کے مطالعہ اور اسلامی احکام و تعلیمات سے ان کے تقابل سے واضح ہوتا ہے کہ ملت ابراہیمی کے تمام عناصر اسلام میں باقی رکھے گئے ہیں۔

ا۔ توحید ملت ابراہیمی کا سب سے اہم رکن ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا خاندان اور پوری قوم شرک میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی دعوت میں توحید پر سب سے زیادہ زور دیا اور شرک پر سخت تنقید کی۔ قرآن میں آپ کی ایک صفت ''حنیف'' بیان کی گئی ہے۔ حنیف اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق استوار کر لے۔ ایسے تمام مقامات پر جہاں حضرت ابراہیمؑ کے لیے لفظ 'حنیف' استعمال کیا گیا ہے وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یا اس جیسے الفاظ بھی لائے گئے ہیں۔ اسلام میں توحید کی جو اہمیت ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس کی پانچ اہم بنیادوں میں سے ایک توحید ہے۔ شرک اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قدر ناپسندیدہ ہے کہ اس میں مبتلا شخص کی کسی حال میں مغفرت نہیں ہو سکتی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ (النساء: ۴۸)

اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا۔ اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔

۲۔ ملت ابراہیمؑ میں ہمیں رسالت اور آخرت کے عقائد بھی ملتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ ہدایت پانے کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ وہ اپنے رب کی طرف سے لے کر آئے ہیں، انھیں قبول کیا جائے اور ان کی اتباع کی جائے۔ اگر اس سے روگردانی کی گئی تو ایک دن ایسا آئے گا جب اس کے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان دونوں عقائد کو اسلام میں بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

۳۔ ملت ابراہیمی کی طرح اسلام میں بھی عبادات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور دیگر اعمال صالحہ سے متعلق احکام اور ترغیبات قرآن کریم کے بڑے حصے پر مشتمل ہیں۔ بعض آیات سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ چیزیں ملت ابراہیمی میں بھی مشروع تھیں۔ سورۂ حج میں ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱرْكَعُوا وَٱسْجُدُوا وَٱعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَٱفْعَلُوا ٱلْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۩ وَجَـٰهِدُوا فِى ٱللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِۦ ۚ هُوَ ٱجْتَبَىٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى ٱلدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَٰهِيمَ ۚ (الحج:۷۷-۷۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو رکوع اور سجدہ کرو۔ اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو۔ اسی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمھیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔

ان آیات کے شروع میں رکوع اور سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ نماز سے عبارت ہے، رکوع اور سجدہ جس کے اہم ارکان میں سے ہیں۔ واعْبُدُوا رَبَّكُمْ کے ذریعے دیگر عبادات اور وَافْعَلُوا الْخَيْرَ کے ذریعے تمام اعمال صالحہ کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد واضح کیا گیا کہ یہ تمام اعمال تمہارے لیے باعث مشقت نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تمہارے بس میں ہیں اور ان کی انجام دہی موجب فلاح وسعادت ہے۔ آخر میں ملت ابراہیمی کا تذکرہ کیا گیا۔ یہاں اس کے ذکر کی دو توجیہیں کی گئی ہیں: ایک یہ کہ دین کے ان اعمال میں تمہارے لیے کوئی تنگی نہیں ہے، جس طرح کہ ملت ابراہیمی میں کوئی تنگی نہیں تھی۔ ک (حرف تشبیہ) یہاں محذوف ہے جس کی وجہ سے ملة کو منصوب لایا گیا ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہاں 'الزموا' محذوف ہے۔ یعنی یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی ملت کے ارکان ہیں، انھیں اختیار کرو۔[1]

۴۔ ملت ابراہیمی میں 'ختنہ' کو شعار کا درجہ حاصل ہے۔ توریت کے مطابق اسے اس عہد کی ایک ظاہری علامت قرار دیا گیا تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی نسل سے کیا تھا کہ اگر وہ توحید پر قائم رہے گی تو اسے زمین پر اقتدار عطا کرے گا۔[2]

(۱) تفسیر طبری قدیم ایڈیشن، جز ۱۷، ص ۱۲۹-۱۳۰، تفسیر ابن کثیر ۳/۲۳۶

(۲) کتاب پیدائش باب ۱۷: ۹-۱۱

اسی لیے یہود کے نزدیک اس کی بہت اہمیت تھی۔ غیر مختون شخص کو بے دین سمجھا جاتا تھا۔(۱) نصاریٰ نے اس شعار کو ترک کر دیا اور اسے غیر ضروری قرار دے دیا۔ اسلام میں اس معاملے میں وہ شدت نہیں پائی جاتی جو یہود کے یہاں موجود تھی، لیکن ختنہ کو خصال فطرت میں شمار کیا گیا ہے اور اس پر عمل کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

من الفطرة الختان (۲)

امور فطرت میں سے ایک ختنہ ہے۔

ایک حدیث میں ختنہ کو سنت قرار دیا گیا ہے حضرت اسامہ ہذلیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الختان سنة للرجال (۳)

ختنہ مردوں کے لیے سنت ہے

ج۔ فریضۂ حج

اسلامی عبادات میں ایک اہم عبادت 'حج' ہے۔ ملت ابراہیمی میں بھی اسے اہم مقام حاصل تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر خانۂ کعبہ کی تعمیر کی، اسے توحید کے ایک مرکز کی حیثیت دی۔ طواف، اعتکاف اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے اسے پاک وصاف رکھا اور لوگوں میں حج کی منادی کی۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ٥ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ٥ (الحج: ۲۶،۲۷)(۴)

یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر (خانۂ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی

---

(۱) حوالہ سابق باب ۱۷: ۱۴

(۲) صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب قص الشارب

(۳) مسند احمد ۵/ ۷۵

(۴) مزید دیکھئے البقرہ: ۱۲۵

(اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام ورکوع وسجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں۔

حضرت ابراہیم نے اعلان حج کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں حج کے ارکان و مناسک ادا کر کے عملی نمونہ بھی پیش کیا۔ ان کی منادی پر لوگوں نے لبیک کہا اور دور دراز مقامات سے ہر سال حج کے لیے آنے لگے۔ اس طرح حج ملت ابراہیمی کا ایک اہم رکن قرار پایا۔ بنی اسماعیل اس رکن کو مضبوطی سے تھامے رہے۔ ان کے دل میں خانۂ کعبہ کی عظمت باقی رہی اور وہ برابر ہر سال اس کا حج کرتے رہے۔ اگرچہ انھوں نے خانۂ کعبہ میں سیکڑوں بت بھی رکھ چھوڑے تھے اور طریقۂ حج میں بعض مشرکانہ چیزیں بھی داخل کر لی تھیں۔ زمانۂ جاہلیت میں حج کرنے والوں کو ''حنفاء'' کہا جاتا تھا گویا حنیفیت پر عمل پیرا ہونے کا ایک مظہر حج کرنا تھا۔[1]

اسلام میں فریضۂ حج کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور خانۂ کعبہ کو صرف خدائے واحد کی عبادت کے لیے قائم ہونے والا، متعدد روشن نشانیوں کا حامل اور جائے امن قرار دیتے ہوئے اس کی زیارت کو فرض کیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ۝ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۗ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝ (آلِ عمران:۹۶،۹۷)

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ ابراہیم کا مقام عبادت ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

(۱) تفسیر طبری ۳/۱۰۶، اہل تفسیر میں ابن عباس، مجاہد، حسن اور عطیہ نے حنیفیت کی تشریح ''حج البیت'' سے کی ہے۔ دیکھیے تفسیر طبری ۳/۱۰۴-۱۰۶

اسلام میں حج کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا سکتا ہے کہ احادیث میں اسے افضل ترین اعمال میں شمار کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے آپؐ سے سوال کیا: سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپ نے جواب دیا: اللہ اور رسول پر ایمان۔ اس نے دریافت کیا: پھر؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد۔ اس نے پھر یہی سوال دہرایا تو آپ کا جواب تھا: ''حج مبرور'' (مقبول حج)(۱)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

الحج المبرور لیس له جزاء الّا الجنة (۲)

مقبول حج کی جزا بس جنت ہے

د۔ آخرت میں جزا و سزا کا دارومدار انسان کے ذاتی اعمال پر ہے

ملت ابراہیمی کی ایک اہم تعلیم یہ تھی کہ دنیا میں انسان اپنے تمام اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ سورۃ النجم میں صحف ابراہیمی کی جو تعلیمات نقل کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے: ''اَلَّا تَزِرَ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی'' (یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)۔

ملت ابراہیمی کی طرح اسلام میں بھی اس تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

قرآن اور سنت کا پورا ذخیرہ اس سے پر ہے۔ آیت کا یہ ٹکڑا ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی'' مزید چار مقامات پر آیا ہے۔(۳) سورہ اسراء میں ہے:

مَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۭ (بنی اسرائیل:۱۵)

جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

سورۂ انعام کی آخری آیات میں پہلے آں حضرت ﷺ کو اس اعلان کا حکم دیا گیا کہ ''مجھے میرے رب نے سیدھا راستہ دکھایا ہے، دین قیم، ملت ابراہیمؑ''.... اس کے بعد ساتھ ہی یہ کہنے کی بھی ہدایت کی گئی:

(۱) صحیح بخاری، کتاب المناسک، باب فضل الحج المبرور

(۲) موطا امام مالک، کتاب الحج، باب جامع ماجاء فی العمرة، صحیح بخاری، کتاب العمرة، باب وجوب العمرة وفضلها

(۳) وہ مقامات یہ ہیں: الانعام:۱۶۴، الاسراء:۱۵، فاطر:۱۸، الزمر:۷

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ (الانعام: ۱۶۴)

ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمے دار وہ خود ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ملت ابراہیمی کے مجدّد

حضرت ابراہیم نے خانۂ کعبہ کی دیواریں کھڑی کرتے وقت بارگاہ الٰہی میں جو دعائیں کی تھیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ میں نے اپنی جس اولاد کو اس وادی میں لا بسایا ہے اس کی نسل سے ایک رسول بھیج جو ان کی تعلیم اور تربیت کرے اور انھیں دین کی باتیں سکھائے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ (البقرہ: ۱۲۹)

اے رب ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔

یہ دعا بارگاہ الٰہی میں قبول ہوئی اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ ٹھیک ٹھیک ملت ابراہیمی کی پیروی کریں۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ (النحل: ۱۲۳)

پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ ابراہیم کے طریقے پر چلو جو اللہ کے لیے یکسو تھا۔

یہود اور نصاریٰ نے ملت ابراہیمی میں اپنی مرضی کی مطابق تبدیلیاں کر لی تھیں اور اپنے خود ساختہ تصورات اور مزعومات کو ملت ابراہیمی کا نام دے دیا تھا۔ مثال کے طور پر انھوں نے دین داری کے نام پر بعض پاک چیزیں حرام کر لی تھیں اور اپنے اوپر ایسے بوجھ لاد لیے تھے اور ایسی پابندیاں عائد کر لی تھیں جن کی دین میں کوئی سند نہیں تھی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ملت ابراہیمی کی تجدید کریں۔ لوگوں نے خود سے جو طوق اور بیڑیاں پہن رکھی ہیں ان سے آزاد کر دیں اور جو بوجھ لاد رکھے ہیں انھیں اتار پھینکیں۔ سورۂ اعراف میں یہود و نصاریٰ کو ''نبی امی'' پر ایمان لانے کی تلقین کرتے ہوئے اس کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان میں یہ اوصاف بھی ہیں:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف: ۱۵۷)

وہ (رسول) ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔ اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

حضرت ابوامامہ الباہلیؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے اجازت چاہی کہ وہ دنیا سے کٹ کر کچھ دن ایک غار میں رہنا چاہتا ہے جہاں کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

انی لم ابعث باليهودية ولا بالنصرانية ولكنى بعثت بالحنيفية السمحة.(۱)

میں یہودیت یا نصرانیت کے ساتھ نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ میری بعثت حنیفیت کے ساتھ ہوئی ہے جس میں نرمی ہے۔

ایک دوسری روایت جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

يومئذ لتعلم يهود ان فى ديننا فسحة، إنى ارسلت بحنيفية سمحة(۲)

آج یہود کو جان لینا چاہیے کہ ہمارے دین میں کشادگی ہے۔ میں حنیفیت کے ساتھ بھیجا گیا ہوں جس میں نرمی ہے۔

ملت ابراہیمی سے اس تعلق خاص کی بنا پر آپ کی خواہش تھی کہ آپ کی نمازوں کا قبلہ حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کردہ گھر خانۂ کعبہ ہو۔ لیکن چونکہ شروع میں آپ کا معمول یہ تھا کہ جن معاملات میں آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی واضح رہنمائی نہ ہوتی ان میں آپ انبیاء سابقین کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ قبلہ کے معاملے میں بھی آپ نے ایسا ہی کیا اور بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ لیکن مکہ میں رہتے ہوئے آپ اس طرح

---

(۱) مسند احمد ۵/۲۶۶

(۲) مسند احمد ۶/۱۱۶، ۲۳۳

نماز ادا کرتے تھے کہ بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں سامنے ہوتے تھے۔ مدینہ ہجرت کرنے بعد جب ایسا کرنا ممکن نہ رہا کیونکہ دونوں الگ الگ سمتوں میں پڑتے تھے تو قبلۂ ابراہیمی سے انقطاع آپ پر شاق گزرنے لگا اور آپ کے دل میں بار بار یہ خواہش ابھرتی تھی کہ کاش وحی الٰہی سے آپ کو خانۂ کعبہ کی جانب رخ کرنے کا حکم دے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ خواہش پوری فرمائی اور تحویل قبلہ کا حکم دے دیا:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۖ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ (البقرہ:۱۴۴)

اے نبی یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو ہم اسی قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔

اسی طرح طریقۂ حج میں بھی آپؐ نے اصلاحات فرمائیں۔ لوگوں نے اس میں جو مشرکانہ اعمال داخل کر رکھے تھے یا دنیاوی اغراض و مصالح کی بنا پر جو تبدیلیاں کر لی تھیں ان کو ختم کر کے صحیح طریقے پر حج کے مناسک بتائے اور ان پر خود عمل کر کے دکھایا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جب انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر آپ کے ہم رکاب تھا، آپ نے حج کا عملی نمونہ پیش فرمایا اور حج کے مراسم و مناسک سے متعلق لوگوں کے سوالات کے جوابات دیے۔ ایک موقع پر آپ نے صحابہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

قفوا علٰی مشاعرکم فانکم علی ارث من ارث ابراهیم.(۱)

اپنے مناسک سے متعلق واقفیت حاصل کرو۔ تم میراث ابراہیمی کے امین ہو۔

ملت ابراہیمی کی دعوت اسلام کی دعوت ہے

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے جو دین لے کر آئے وہ کوئی نیا اور انوکھا دین نہیں تھا بلکہ وہ انہی بنیادی تعلیمات پر مشتمل تھا جن کے ساتھ گزشتہ تمام انبیاء مبعوث ہوئے تھے اور جنھیں لے کر حضرت ابراہیمؑ تشریف لائے تھے۔ دیگر انبیاء کے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ کا امتیاز یہ ہے کہ دنیا کے بڑے مذاہب میں اسلام کے ساتھ یہودیت اور عیسائیت کے پیرو بھی

(۱) سنن ابوداؤد، کتاب المناسک، باب موضع الوقوف بعرفۃ، جامع ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی الوقوف بعرفات والدعاء فیہا، مسند احمد ۴/۱۳۷

ان کی جانب شرفِ انتساب رکھتے ہیں۔ آں حضرت ﷺ کی بعثت کے وقت ایک جانب یہود و نصاریٰ اپنی تمام تر گمراہیوں کی باوجود اپنا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ سے جوڑتے تھے اور اپنی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں کے لیے ملت ابراہیمی سے سند لاتے تھے۔ دوسری جانب مشرکین مکہ بھی حضرت ابراہیمؑ کو اپنا جدامجد کہتے تھے اور صریح شرک میں مبتلا ہونے کے باوجود خود کو ان کا پیرو بتاتے تھے۔ اس صورتِ حال میں ان تمام لوگوں کو ملت ابراہیمی کے اتباع کی دعوت دی گئی۔ اس کی حکمت یہ تھی کہ اس طرح ان پر یہ واضح کیا گیا کہ تمہیں جس چیز کی طرف دعوت دی جارہی ہے اور جو تعلیمات پیش کی جارہی ہیں وہ نئی اور اجنبی نہیں ہیں، بلکہ وہی ہیں جنھیں لے کر حضرت ابراہیمؑ آئے تھے۔ تم ان سے اپنا تعلق جوڑتے ہو اور ان کی جانب انتساب پر فخر محسوس کرتے ہو، لیکن ان کے بتائے ہوئے راستے سے منحرف ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کا لایا ہوا دین وہی ہے جسے آج محمد ﷺ پیش کررہے ہیں۔ اسلام ملت ابراہیمی ہی کا دوسرا نام ہے۔ ملت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اسلام کو قبول نہ کرنا اور اس سے روگردانی کرنا تو بڑی نادانی کی بات ہے۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ط (البقرہ: ۱۳۰)

اب کون ہے جو ابراہیمؑ کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کرلیا ہو اس کے سوا کون یہ حرکت کرسکتا ہے؟

اس آیت کی تفسیر میں قتادہ، ربیع اور دیگر اہل تفسیر نے بیان کیا ہے کہ اس میں اشارہ یہود اور نصاریٰ کی طرف ہے جنھوں نے ملت ابراہیمی سے روگردانی اختیار کر کے یہودیت اور نصرانیت کے نام سے مذاہب گھڑ لیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کو ملت ابراہیمی کے ساتھ مبعوث کیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ اس پر ان کی سرزنش کی جارہی ہے۔[1]

قرآن کی بعض آیات میں اسلام کو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین قرار دیا گیا ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف (آلِ عمران: ۱۹)

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

---

(۱) تفسیر طبری ۸۹/۳

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آلِ عمران:۸۵)

اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

اسی بات کو دوسرے مقام پر دوسرے انداز سے یوں کہا گیا ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (النساء: ۱۲۵)

اس شخص سے بہتر اور کس کا طریقۂ زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویّہ نیک رکھا اور ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، جو حنیف تھا۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ دین کون سا ہے؟ فرمایا: ''الحنيفية السمحة'' (1) (حنیفیت جس میں نرمی پائی جاتی ہے)

معلوم ہوا کہ ملت ابراہیمی کی دعوت درحقیقت اسلام کی دعوت ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا وہ دین ہے جسے لے کر تمام انبیاء آئے تھے۔ بعد میں ان کے متبعین نے اپنی خواہشوں کے مطابق ان میں تحریفات کر کے نئے نئے مذاہب ایجاد کر لیے۔ حضرت ابراہیمؑ بھی اسی دین کو لے کر آئے تھے۔ ان کے بعد ان کے ماننے والوں نے اس میں بہت سی تحریفات کر دی تھیں۔ یہودیت اور نصرانیت اسی دین کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے اس کی تجدید کی اور اسے بے کم و کاست پیش کیا۔

(1) مسند احمد ۲۳۶/۱، صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب الدین یسر (تعلیقا)

بابِ چہارم

اسوۂ ابراہیمؑ

قرآن کریم میں جہاں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا اور ملت ابراہیمی کے عناصر کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے وہیں آپ کی سیرت پر بھی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، ذاتی اوصاف نمایاں کیے گئے ہیں اور آپ کی نجی زندگی کو اسوہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اللہ پر ایمان کے معاملے میں قوم سے حضرت ابراہیم کے اعلان براءت کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ إِبْرَاهِيْمَ. (الممتحنۃ: ۴)

تم لوگوں کے لیے ابراہیم میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کے سلسلے میں حضرت ابراہیمؑ کی زندگی ایک مثالی زندگی تھی۔ انھوں نے ماسوا اللہ سے تعلق منقطع کر کے صرف اللہ واحد سے اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ زندگی کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک معاملے میں وہ اللہ کی مرضی کی پابندی کرتے تھے۔ اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرتے۔ اپنی کوتاہیوں پر انابت و استغفار کرتے اور ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کے لیے اس کے سامنے دست دعا پھیلاتے تھے۔ اپنے باپ، بیوی بچوں اور ماتحتوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ ادب واحترام، دل سوزی محبت وشفقت اور بردباری پر مبنی تھا۔ وہ اخلاق فاضلہ کا اعلیٰ نمونہ تھے۔

قرآن کریم میں مختلف مقامات پر سیرت ابراہیمی کی ان جزئیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کا دم بھرنے والے اور ان سے نسبت پر فخر کرنے والے ان کے اخلاق واوصاف کو نمونہ بنائیں اور انھیں اپنی زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش کریں۔

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا ۗ (آلِ عمران: ٦٨)

ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔

آئندہ سطور میں ہم حضرت ابراہیمؑ کے انہیں اوصاف کو یکجا کر کے پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

ا۔ شرک سے بے زاری (حنیفیت)

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا سب سے نمایاں اور امتیازی وصف، ان کا شرک و بت پرستی سے براءت و بے زاری اور خدائے واحد پر ایمان ہے۔ ان کی پیدائش اور پرورش ایک ایسی قوم میں ہوئی جس میں بتوں اور ستاروں کی پرستش عام تھی۔ سیکڑوں دیوی دیوتاؤں کو خدائی میں شریک کرلیا گیا تھا اور ان کے سامنے جبین نیاز خم کی جاتی تھی۔ ان کا باپ بت پرست بھی تھا اور بت ساز بھی اور اسے سوسائٹی میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو انہیں اس ماحول میں سخت گھٹن محسوس ہوئی۔ ان کی فطرت نے انہیں توحید تک رہنمائی کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے انہیں منصب نبوت سے سرفراز کیا تو انہوں نے اپنے باپ اور قوم کو راہ ہدایت کی طرف بلانے کے ساتھ شرک سے اپنی بے زاری اور براءت کا بھی اعلان کر دیا:

يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۝ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

(الانعام: ۷۸، ۷۹)[1]

اے برادرانِ قوم: میں ان سب سے بیزار ہوں، جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں نے تو یکسو ہوکر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کرلیا، جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اس اعلان کے بعد ان کی قوم بحث و مجادلہ کے درپے ہوئی تو اس کی بھی انہوں نے مطلق پروانہ کی اور اس سے دوٹوک انداز میں کہہ دیا:

---

(۱) مزید دیکھئے الزخرف: ۲۶-۲۷

اَتُحَآجُّوْنِّیْ فِی اللّٰہِ وَقَدْ هَدٰنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَاتُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ.

(الانعام: ۸۰)

کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھادی ہے اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ حال نبوت کے بعد ہی کا نہ تھا بلکہ وہ اپنی ابتدائی زندگی ہی سے فطرت سلیم پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں رشد و ہدایت کے جادۂ مستقیم پر قائم رکھا تھا۔ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ ۝

(الانبیاء: ۵۱)

اس سے پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے۔

اس آیت میں 'رشد' سے اگرچہ بعض مفسرین نے نبوت مراد لی ہے، لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک اس کا مطلب ہدایت، معرفت الٰہی، ہوشمندی اور راست روی ہے۔ 'مِنْ قَبْلُ' کی بھی دو توجیہیں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد ہے 'حضرت موسیٰؑ سے پہلے' جن کا تذکرہ ماقبل آیات میں موجود ہے۔ دوسری یہ کہ اس سے ابتدائی عمر کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو بچپن ہی سے رشد و ہدایت سے نوازا تھا۔ پہلی توجیہ حضرت ابن عباسؓ سے اور دوسری ان کے شاگرد حضرت مجاہد سے منقول ہے۔[۱] مفسرین میں سے ابن جریر طبریؒ نے پہلی اور ابن کثیرؒ نے دوسری توجیہ کو اختیار کیا ہے۔[۲] بعد کے مفسرین نے ان دونوں توجیہوں کو نقل کر دیا ہے یا ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔[۳] اس کی بعض اور توجیہیں بھی کی گئی ہیں۔[۴]

حضرت ابراہیمؑ کے اس امتیازی وصف کو نمایاں کرنے کے لیے قرآن نے متعدد تعبیریں اختیار کی ہیں۔ سورۂ صافات میں ہے:

وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ ۝ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۝

(الصافات: ۸۳-۸۴)

---

(۱) تفسیر طبری ۱۷/۱۴، تفسیر کبیر ۶/۱۲۶

(۲) تفسیر طبری حوالہ سابق، تفسیر ابن کثیر ۳/۱۸۱

(۳) کشاف ۲/۵۷۵، تفسیر خازن ۴/۲۴۱، تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، حوالہ سابق، روح المعانی جزء ۱۷ ص ۵۸

(۴) دیکھیے تفسیر کبیر، حوالہ سابق

اور اس کے (حضرت نوح کے) طریقے پر چلنے والا ابراہیم تھا جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا۔

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کو "پاکیزہ دل" کہا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا عام مفہوم مراد لیا ہے۔ یعنی ایسا دل جو تمام اعتقادی و اخلاقی خرابیوں سے پاک ہو۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ یہاں یہ لفظ مطلق آیا ہے، اس لیے اسے کسی ایک معنی کے لیے خاص کرنا مناسب نہیں۔ (۱) جب کہ بعض دوسرے مفسرین کے نزدیک اس سے مراد ہے "شرک کی آلودگی سے پاک دل۔" اس کی دلیل یہ ہے کہ مابعد آیات میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے شرک میں مبتلا ہونے پر ان کی مذمت کی ہے۔ (۲) ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ، حسنؒ، سدیؒ وغیرہ سے بھی یہی تاویل مروی ہے۔ (۳)

حضرت ابراہیمؑ کی حق پرستی اور شرک سے بے زاری کو نمایاں کرنے کے لیے قرآن نے ایک لفظ 'حنیف' کا استعمال کیا ہے۔ یہود اور نصاریٰ میں سے ہر ایک' باوجود اپنی تمام گمراہیوں اور صریح شرک کے، دعویٰ کرتا تھا کہ صرف وہی حضرت ابراہیمؑ کے بتائے ہوئے طریقے پر ہے۔ اس کے جواب میں ان سے کہا گیا:

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلاَ نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (آل عمران:٦٧)

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

لفظ 'حنیف' کا مادہ 'حنف' ہے۔ لغت میں اس کے اصل معنی کیا ہیں؟ اس سلسلے میں ماہرین لغت سے دو اقوال منقول ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔ عربی زبان میں احنف اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دونوں پیر مڑے ہوئے ہوں۔ اس اعتبار سے حنیف کے معنی ہوں گے وہ شخص جو ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کے دین کی طرف مائل ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حنف کے معنی سیدھا ہونے کے ہیں۔ عربی زبان میں لنگڑے کے لیے احنف کا لفظ اچھے شگون کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے متعدد الفاظ ہیں جنہیں برعکس مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جس شخص کو کوئی موذی کیڑا، سانپ بچھو وغیرہ کاٹ لے اسے سلیم (لفظی معنی

(۱) کشاف ۳/۳۴۴، تفہیم القرآن ۴/۲۹۲
(۲) تفسیر کبیر ۷/۱۴۴
(۳) تفسیر طبری ۲۳/۴۴، تفسیر ابن کثیر ۴/۱۲

نجات پانے والا) اور کھائی کو مفازۃ (لفظی معنی جائے نجات) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے حنیف اس شخص کو کہا جائے گا جو ٹھیک اللہ کے دین پر قائم ہو، اس سے سر مو بھی انحراف نہ کرے۔(۱)

بہر حال ان میں سے جو معنی بھی اختیار کیے جائیں، قرآن کی اصطلاح میں حنیف سے مراد وہ شخص ہے جو شرک سے بالقصد اعراض کر کے اور اسے علیٰ وجہ البصیرۃ ترک کر کے حق کی طرف رجوع ہو، اس طور پر کہ اسے کوئی چیز حق قبول کرنے سے باز نہ رکھ سکے۔(۲) یہ لفظ قرآن میں دس مقامات پر آیا ہے۔ ان میں سے آٹھ مقامات پر اس کا استعمال حضرت ابراہیمؑ کے لیے ہوا ہے اور ایک جگہ کے علاوہ سب جگہوں پر اس کے بعد 'وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ' یا اس جیسے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال شرک کے بالمقابل ہوا ہے۔

۲۔ کامل اطاعت الٰہی

حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی نگاہوں کے سامنے ہو تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے پورے طور پر خود کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیا تھا۔ اور اس کے ارشادات و احکام پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے انھیں وطن میں رہ کر دعوت کا مشن جاری رکھنے کا حکم دیا۔ وہ سخت سے سخت حالات کی پروا کیے بغیر اس فریضہ کو سرانجام دیتے رہے۔ ان کی قوم نے آبائی دین کی توہین کے جرم میں آگ میں ڈال دیا تو اس موقعے پر بھی انھوں نے بے مثال استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے گھر بار، خاندان اور وطن کو چھوڑ کر ہجرت کرنے کا حکم دیا تو اس حکم کے آگے تسلیم خم کر دیا۔ بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اولاد سے نوازا جو مستقبل کا سہارا اور امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔ مگر جب اسے اپنی ماں کے ساتھ بے آب و گیاہ وادی میں لا بسانے کا حکم دیا تو اس پر عمل کرنے میں بھی پس و پیش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پھر جب اس دشت غربت میں اس اکلوتے اور محبوب فرزند کی گردن پر چھری پھیر دینے کا اشارہ ملا تو اس پر عمل کرنے کے لیے بھی اپنی آستینیں چڑھا لیں۔ گویا حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت، خود سپردگی اور نفس کو مرضی مولا کے تابع کر دینے کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قرآن نے اسی چیز کو لفظ ''اسلام'' سے تعبیر کیا ہے۔

---

(۱) تفسیر کبیر ۱/۵۱۸، تفسیر طبری طبع جدید ۳/۱۰۴، لسان العرب ۹/۵۷ مادہ 'حنف'

(۲) تفسیر ابن کثیر ۱/۵۵۹، المفردات فی غریب القرآن۔ اصفہانی۔ ص ۱۳۳

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ○ (البقرہ: ۱۳۱)

اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا ''مسلم ہو جا'' تو اس نے فوراً کہا ''میں مالک کائنات کا 'مسلم' ہو گیا۔

اسلام کے لفظی معنی اطاعت وفرماں برداری، خضوع، خودسپردگی اور اخلاص کے ہیں۔ مسلمان کو 'مسلم' اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی اطاعت کے لیے ہمہ تن آمادہ رہتا ہے(۱) زید ابن عمرو بن نفیل جن کا شمار عہد جاہلیت کے حنفاء میں ہوتا ہے، ان کے دو اشعار یہ ہیں:

وَاَسْلَمْتُ وَجْهِي لِمَنْ اَسْلَمَتْ ... لَهُ الْاَرْضُ تَحْمِلُ صَخْرًا ثِقَالًا
وَاَسْلَمْتُ وَجْهِي لِمَنْ اَسْلَمَتْ ... لَهُ الْمُزْنُ تَحْمِلُ عَذْبًا زُلَالًا(۲)

میں نے اس ذات باری کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیا ہے، جس کے حکم پر زمین بھاری چٹانوں کو اٹھائے ہوئے ہے اور بادل میٹھا پانی لے کر اِدھر اُدھر جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی زبان مبارک سے اظہار اطاعت کا بیان ہے۔ مگر آیت کو اسی محدود معنی تک رکھنا صحیح نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے نہ صرف زبان قال سے فرماں برداری کا اظہار کیا بلکہ زندگی کے ہر لمحے میں زبان حال سے اس کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ راغب اصفہانی نے لکھا ہے:

> ''اسلام کے لیے محض زبانی اعتراف کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ضروری ہے کہ دل میں وہی بات ہو جس کا زبان سے اظہار کیا جا رہا ہے، عمل سے بھی اس کی تصدیق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلے کر دیے ہیں اور جو چیزیں مقدر کر دی ہیں ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں مذکور ہے''(۳)

حضرت ابراہیمؑ کی اطاعت الٰہی کا نقطۂ عروج ہمیں واقعۂ ذبح میں نظر آتا ہے۔ خواب میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیٹے کو ذبح کرنے کا اشارہ پا کر وہ فوراً اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بیٹے سے اس خواب کا ذکر کیا تو اس نے بھی احکام الٰہی کے سامنے اپنی جبین نیاز خم کر دی۔ دونوں کی اس کیفیت کو قرآن نے لفظ ''اسلام'' سے تعبیر کیا ہے:

---

(۱) تفسیر طبری (جدید) ۲/۵۱۰-۵۱۱، کشاف ۱۰/۳۱۱، تفسیر کبیر ۷/۱۵۳

(۲) سیرت ابن ہشام ۱/۲۴۹

(۳) مفردات اصفہانی ص ۲۴۰ مادہ ''سلم''

فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَتَلَّهٗ لِلۡجَبِیۡنِ ۚ وَنَادَیۡنٰهُ اَنۡ یّٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ ۙ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ

(الصافات:۱۰۳-۱۰۵)

آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیمؑ تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔

بائبل میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی، اللہ کی اطاعت اور رضا طلبی کا بارہا تذکرہ آیا ہے:

''خداوند نے ابرہام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے واروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا، جو میں تجھے دکھاؤں گا.....سو ابرام خدا کے کہنے کے مطابق چل پڑا۔ (۱)

''خداوند فرماتا ہے: چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی، جو تیرا اکلوتا ہے، دریغ نہ رکھا، اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا.......کیونکہ تو نے میری بات مانی''(۲)

(یسوع-حضرت عیسیٰ - نے کاہنوں سے کہا) ''میں تمہارے خلاف پکار کر کہتا ہوں کہ تم شیطان کی اولاد ہو نہ کہ ابرہام کی جس نے خدا کی محبت میں اپنے باپ کا گھر چھوڑ دیا اور اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر تیار ہو گیا''(۳)

''خدا کے کہنے کے مطابق'' ''تو نے میری بات مانی'' ''خدا کی محبت میں'' جیسے الفاظ سے حضرت ابراہیمؑ کی کامل اطاعتِ الٰہی اور مرضی رب کے آگے خود سپردگی کا اظہار ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے جذبۂ اطاعت اور مکمل فرماں برداری پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَاِبۡرٰهِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی ۙ (النجم:۳۷)

اور ابراہیمؑ جس نے وفا کا حق ادا کر دیا۔

دوسری جگہ ہے:

---

(۱) کتاب پیدائش باب۱۲: ۱-۴

(۲) کتاب پیدائش باب۲۲: ۱۶-۱۸

(۳) برنا باس کی انجیل ص ۸۲-۸۳

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا ط وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (النحل: ۱۲۰)

واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا۔ اللہ کا مطیع فرمان اور یک سو، وہ کبھی مشرک نہ تھا۔

قنوت کے معنی اطاعت گزاری اور تابع داری کے ہیں۔ حضرات صحابہ میں سے ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ اور حضرات تابعین میں سے مجاہدؒ اور قتادہؒ نے قانت کی تشریح 'مطیع' سے کی ہے۔[۱] راغب اصفہانی نے لکھا ہے: خضوع کے ساتھ اطاعت کرنے کو قنوت کہتے ہیں''[۲]

اس آیت میں لفظ 'اُمّۃ' کے کیا معنی ہیں؟ اس سلسلہ میں اہل تفسیر سے مختلف اقوال مروی ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ امت سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کو اچھائی کی تعلیم دیتا ہے۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں: لفظ اُمّۃ اپنے معروف معنی میں ہے۔ اپنے عہد میں حضرت ابراہیمؑ تنہا مومن تھے۔ باقی تمام لوگ کافر تھے۔ اس بنا پر انھیں تن تنہا ایک امت قرار دیا گیا۔

حضرت قتادہ کے نزدیک اس کے معنی امام کے ہیں۔[۳]

متاخرین میں مولانا فراہیؒ نے امۃ کو اطاعت گزار کے معنی میں لیا ہے اور اس معنی کی تعیین میں بعض جاہلی اشعار سے استشہاد کیا ہے۔[۴]

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی وفاداری، بے کم و کاست اطاعت اور خودسپردگی کا صلہ یہ دیا کہ انھیں رہتی دنیا تک کے لیے امام بنا دیا۔ قرآن کہتا ہے:

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ط قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ط (البقرہ: ۱۲۴)

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۲/۵۹۱

(۲) مفردات اصفہانی ص ۴۲۴ مادہ 'قنت'

(۳) تفسیر ابن کثیر ۲/۵۹۱

(۴) التکمیل فی اصول التاویل۔ فراہی ص ۵۹، مزید دیکھیے احمد حسن فرحات کا مقالہ ''لفظ امۃ کی تحقیق'' ترجمہ محمد رضی الاسلام ندوی۔ ششماہی علوم القرآن علی گڑھ، جولائی - دسمبر ۱۹۸۷ء

یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا: ''میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔''

اس آیت میں ''کلمات'' سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں متعدد اقوال مروی ہیں۔

علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ''کلمات سے مراد شرائع، اوامر اور نواہی ہیں۔ اور ان کو پورا کر دکھانے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں جس چیز کی بھی ہدایت کی گئی، جس کام کا بھی حکم دیا گیا اور جس بات سے بھی روکا گیا، انھوں نے ٹھیک ٹھیک اس کے مطابق عمل کیا اور اچھے طریقے سے سر انجام دیا۔ ان کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کی، نہ کسی سستی کا مظاہرہ کیا۔ اسی معنی میں سورۃ النجم کی آیت ۳۷ ''وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى'' ہے یعنی انھیں جو حکم بھی دیا گیا اس کی انھوں نے ٹھیک ٹھیک بجا آوری کی۔ عبادت کے کسی موقع پر کوئی چیز ان کی راہ میں حارج نہ ہو پاتی تھی۔''[1]

منصب امامت سے سرفراز کیے جانے کے بعد بھی ان کی اطاعت و فرماں برداری میں ادنیٰ سا فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ ہمہ وقت اپنے تمام کاموں، آرزوؤں، دعاؤں اور حرکات و سکنات میں مرضی رب کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب امامت کی بشارت پا کر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ یہ شرف آئندہ ان کی نسل کو بھی حاصل رہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں واضح کر دیا کہ جو لوگ کفر و شرک میں مبتلا ہو کر ظلم کا ارتکاب کریں گے اس عہد کا ان سے کوئی تعلق نہ ہوگا (البقرہ:۱۲۵) تو اس فیصلہ الٰہی کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ذہن میں اس حد تک مستحضر رکھا کہ جب انھوں نے مکہ کے باشندوں کے لئے غذائی ضروریات کی فراوانی کی دعا کی تو پہلے ہی صراحت کر دی گئی کہ میری یہ دعا صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ اور روز آخر پر ایمان لائیں (البقرہ:۱۲۶) اس سے حضرت ابراہیمؑ کے بلند مرتبہ تسلیم و رضا کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انھیں اشارہ بھی مل گیا کہ فلاں سمت میں رب کی رضا ہے تو فوراً ادھر چل پڑے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے وضاحت کر دی کہ امامت پر معیشت دنیا کے معاملات کو قیاس کرنا صحیح نہیں۔ ایمان کی تخصیص صرف امامت کے معاملے میں ہے۔ جہاں تک روزی کا سوال ہے اس سے اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور کافروں دونوں کو نوازتا ہے۔ (البقرہ:۱۲۶)[2]

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۵۵۹، مزید دیکھئے تفسیر کبیر ۱/۴۹۲

(۲) تفسیر کبیر ۱/۵۰۲، تدبر قرآن ۱/۲۹۳

۳۔ استغفار و انابت

اللہ تعالیٰ سے اس درجہ قربت رکھنے اور اس کے ایک اشارے کی فوراً تعمیل کرنے کے باوجود حضرت ابراہیمؑ کو ہمہ وقت احساس رہتا تھا کہ کہیں ان سے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی نہ ہوگئی ہو۔ یہ احساس انھیں توبہ و استغفار اور رجوع و انابت پر آمادہ کرتا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ ترین صفت ہے، جو کسی مومن بندے میں ہی پیدا ہوسکتی ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کا ایک یہ وصف بھی بیان کیا گیا ہے:

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ○ (هود: ۷۵)

حقیقت میں ابراہیمؑ بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔

لفظ 'منیب' نوب سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا بار بار پلٹنا۔ شہد کی مکھی کے لیے عربی زبان میں ایک لفظ 'نوب' بھی آتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ بار بار اپنے چھتے کی طرف پلٹ کر آتی ہے۔ اللہ کی طرف انابت کا مطلب ہے توبہ و استغفار کے ذریعے اس کی طرف رجوع ہونا اور اخلاص کے ساتھ اس کے حکموں کو بجالانا۔"(۱)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی اور اللہ تعالیٰ کے احسانات گنائے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ مجھے اس سے اپنی مغفرت کی توقع ہے۔

وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَلِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ○ۭ (الشعراء. ۸۲)

اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرمادے گا۔

وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے والدین اور تمام اہل ایمان کے لیے بھی مغفرت اور بخشش کی دعا کرتے تھے:

رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ○ۧ

(ابراهیم: ۴۱)

پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جب کہ حساب قائم ہوگا۔

اس اعلیٰ ترین صفت کا پرتو حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے والوں پر بھی پڑا تھا۔

(۱) مفردات اصفہانی ص ۵۲۸

چنانچہ ان کی طرح وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جبینِ نیاز خم کرتے، اس کی طرف رجوع ہوتے، اس سے مدد چاہتے اور اپنے گناہوں اور لغزشوں پر اس سے مغفرت طلب کرتے تھے۔ ان کی دعا یہ ہوتی تھی۔

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ٥ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ٥ (الممتحنة: ۴،۵)

اے ہمارے رب! تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں کافروں کے لئے فتنہ نہ بنا دے۔ اور اے ہمارے رب! ہمارے قصوروں سے درگزر فرما۔ بے شک تو ہی زبردست و دانا ہے۔

۴۔ شکر

اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات کا احساس بندے میں شکر کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اور اس میں مزید تذلل، خشوع و خضوع اور اطاعت و فرماں برداری پروان چڑھتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اندر یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ ان کا دل اپنے رب کی نعمتوں پر تشکر و امتنان کے جذبات سے لبریز رہتا تھا، جس کا اظہار ان کی زبان سے بھی ہوتا تھا۔ قرآن کہتا ہے:

شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ (النحل: ۱۲۱)

اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔

انعم جمع قلت کا صیغہ ہے۔ اس سے یہ لطیف اشارہ مقصود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس وقت بھی اللہ کے شکر گزار تھے، جب وہ ابھی زیادہ انعامات الٰہی سے بہرہ ور نہیں ہوئے تھے۔[1] اگر کسی شخص پر انعام و اکرام کی بارش ہو جائے تب وہ اپنے محسن کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو، اس میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ قابل تعریف تو وہ شخص ہے، جو معمولی احسان کو بھی مانے اور قلیل نعمتوں پر بھی شکر گزار ہو۔

حضرت ابراہیمؑ کی قوم اپنے آبا و اجداد کی تقلید میں بتوں کو پوجتی تھی۔ انھوں نے اس

(۱) تفسیر کبیر ۵/۳۷۲

کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی مثال دی کہ میں تو اس رب العالمین کی پرستش کرتا ہوں، جس نے مجھ پر نت نئے احسانات کیے ہیں۔ ان احسانات کا تقاضا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے:

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۙ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ ۙ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۙ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۙ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۭ (الشعراء:۷۷-۸۲)

میرے تو یہ سب دشمن ہیں۔ بجز ایک رب العالمین کے جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دے گا۔

انھوں نے قوم کو بھی متوجہ کیا کہ جو اسباب زندگی تمھیں حاصل ہیں، وہ ان کی طرف سے نہیں ہیں، جن کی تم پرستش کرتے ہو بلکہ ان سے تمھیں اللہ تعالیٰ نے نوازا ہے۔ اس لیے اس کا شکر ادا کرو اور صرف اسی کی عبادت بجا لاؤ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (العنکبوت:۱۷)

درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو، وہ تمھیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔

حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت وطن سے ہجرت کی ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان کے یہاں کوئی بچہ ہو جو ان کے کاموں میں مددگار، بڑھاپے کا سہارا اور ان کی دعوت کو جاری رکھنے والا ہو۔ انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے (الصافات:۱۰۰) اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبول بخشا اور انھیں دو اولادیں عطا کیں۔

حضرت ہاجرہ سے اسماعیلؑ اور حضرت سارہ سے اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ دعا کی مقبولیت پر حضرت ابراہیمؑ کا دل جذبۂ تشکر سے بھر گیا، جس کا اظہار ان کی زبان مبارک سے یوں ہوا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ۝ (ابراھیم: ۳۹)

شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے بیٹے دیے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی وادی میں لا بسایا تھا۔ اس وقت وہ جگہ بالکل غیر آباد تھی۔ سنگلاخ زمین کی وجہ سے وہاں سبزا اگتا تھا نہ پیداوار ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اس ویرانے کو آباد کر دے اور وہاں کے باشندوں کے لیے اسباب معاش کی فراوانی کر دے:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ۝ (ابراھیم: ۳۷)

پروردگار! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے۔ شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔

"آیت کے آخر میں لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ کے جو الفاظ آئے ہیں، وہ نہایت معنی خیز ہیں۔ یعنی میں ان کے لیے جو سکون کی زندگی (settled life) کا طالب ہوں تو اس لیے نہیں کہ ان کے لیے سامان عیش کی فراوانی چاہتا ہوں، بلکہ صرف اس لیے اس کا طالب ہوں کہ وہ اپنے مشن کے لیے یکسو رہ کر زیادہ سے زیادہ تیری شکر گزاری کا حق ادا کر سکیں۔"(۱)

۵۔ دعا

دعا اللہ تعالیٰ سے قریب ہونے کا ایک ذریعہ بھی ہے اور بندے اور اس کے رب کے

(۱) تدبر قرآن ۱/۲۹۳

درمیان قربت جاننے کا ایک پیمانہ بھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بندے کی جانب سے اپنے عجز و درماندگی، بے چارگی ومحتاجی اور عبدیت کا اظہار بھی ہے اور اللہ کی قدرت کاملہ، شان بے نیازی اور معبودیت کا اعتراف بھی۔ اسی لیے قرآن وحدیث میں دعا کی بڑی فضیلت آئی ہے اور اس کی بہت تاکید کی گئی ہے۔[1] حضرت ابراہیمؑ کی سیرت طیبہ میں یہ پہلو ہمیں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ توحید کی صدا بلند کرنے کے بعد اپنے باپ اور قوم کی جانب سے انھیں بہت سی تکلیفیں اٹھانی پڑیں، مگر انھوں نے ان کے حق میں دعائے خیر ہی کی۔ بالآخر جب انھیں ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو اس وقت بھی انھوں نے یہی فرمایا:

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَاتَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا٥ (مریم:۴۸)

میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنھیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا۔

ہجرت کرنے کے بعد بھی وہ اپنے باپ کے لیے برابر دعائے خیر کرتے رہے۔ اور اپنے اس معمول پر اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ واضح نہ ہو گیا کہ اسے ہدایت کو توفیق نہیں ملی۔ یہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ٥ (التوبة:۱۱۴)

حق یہ ہے کہ ابراہیمؑ بڑا رقیق القلب وخدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔

اسی طرح جب ''مہمان'' بن کر آنے والے فرشتوں نے انھیں خبر دی کہ وہ قوم لوط کو جس کی نافرمانیاں اور سرکشیاں حد سے تجاوز کر گئی ہیں، ہلاک کرنے آئے ہیں، تو اس موقع پر بھی حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے اور عرض کیا کہ اگر اس بستی میں ابھی کچھ صالح لوگ ہوں تو ان کی بدولت ابھی اس قوم کو کچھ اور مہلت عمل دے دے۔ اس سیاق میں قرآن کہتا ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ٥ (ھود:۷۵)

(۱) مثلاً دیکھیے البقرہ:۱۸۶، مومن:۶۰

حقیقت میں ابراہیمؑ بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔

مذکورہ دونوں آیتوں میں ایک لفظ "اوّاہ" آیا ہے۔ اس کے مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن شدادؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا۔ اے اللہ کے رسول 'اوّاہ' کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا: خشوع اختیار کرنے اور تضرع کرنے والا' پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ۔ (۱)

حضرات زرّ بن حُبیش اور ابوعبیدہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ 'اوّاہ' کے معنی کثرت سے دعا کرنے والے کے ہیں۔ (۲)

اہل تفسیر نے اس کے دوسرے معانی بھی بیان کیے ہیں، لیکن علامہ طبری نے اسی معنی (دعا) کو ترجیح دی ہے۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ سورۂ توبہ کی درج بالا آیت میں حضرت ابراہیمؑ کے اپنے باپ کے لیے دعا و استغفار کرنے کے وعدے کا ذکر ہے۔ (۳)

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کی مختلف مواقع کی دعائیں نقل ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعے سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیمؑ تضرع اور عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے ہاتھ پھیلاتے تھے، اس کے سامنے اپنی ضروریات رکھتے تھے، اپنی آرزوئیں اور تمنائیں بیان کرتے تھے، اس سے مغفرت طلب کرتے تھے اور دنیا و آخرت میں کامیابی کی دعا کرتے تھے۔ ان دعاؤں کو سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

۱. رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ (البقرہ: ۲۶۰)

میرے مالک مجھے دکھادے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔

قرآن میں جس جگہ یہ دعا مذکور ہے وہاں آگے ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے سوال کیا کہ کیا اس بات پر تمہارا ایمان نہیں؟ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا: ایمان تو ہے، البتہ چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبول بخشا اور احیائے موتیٰ کی کیفیت کا مشاہدہ کرایا۔

۲. رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (الصافات: ۱۰۰)

(۱) تفسیر طبری (جدید) ۱۴/۵۳۱-۵۳۲

(۲) حوالہ سابق ۱۴/۵۲۳

(۳) حوالہ سابق ۱۴/۵۳۲

اے پروردگار مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔

یہ دعا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت کی تھی۔ اس وقت تک وہ لاولد تھے۔ اس کی قبولیت کے نتیجے میں پہلے ان کے یہاں حضرت اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی۔ پھر حضرت اسحاقؑ کی۔

۳. رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ۝ۙ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ۝ۙ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ۝ۙ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ۝ۙ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ۝ۙ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ۝ۙ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۝ؕ (الشعراء:۸۳-۸۹)

اے میرے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا۔ اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر۔ اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جب کہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ جب کہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی ہجرت کے موقعے کی ہے۔ اس میں 'حکم' سے مراد علم، حکمت، فہم اور صحیح قوتِ فیصلہ ہے۔ اور سچی ناموری (لسان صدق) طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بعد کی نسلیں مجھے خیر کے ساتھ یاد کریں اور میری زندگی رہتی دنیا تک خلق خدا کے لئے روشنی کا مینار بنی رہے۔[1]

۴. رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ (البقرہ.۱۲۶)

اے میرے رب اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔

۵. رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا

(۱) تفسیر ابن کثیر ۳/۳۳۸

مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ○ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○

(البقرہ:۱۲۷-۱۲۹)

اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے۔ تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو مسلم (مطیع فرماں) بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو جو انھیں تیری آیات سنائے۔ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔

مذکورہ دونوں دعائیں خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر خالص اس کی عبادت کے لیے ایک گھر بنایا۔ اس موقعے پر اپنی نسل اور اپنی دعوت پر ایمان لانے والوں کی مادی اور روحانی بھلائی کے لئے بھی دعا کی۔

۶. رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَّاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ ○ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۖ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ○ رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ○ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ○ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا

وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ٥ رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ع (ابراھیم:۳۵-۴۱)

پروردگار اس شہر (مکہ) کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے (ممکن ہے میری اولاد کو بھی یہ گمراہ کر دیں۔ لہٰذا ان میں سے) جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگزر کرنے والا مہربان ہے۔ پروردگار میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے۔ شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔ پروردگار تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ نہ زمین میں نہ آسمانوں میں۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے بیٹے دیے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔ اے میرے پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں) پروردگار میری دعا قبول کر۔ پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جب کہ حساب قائم ہوگا۔

آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا اس وقت کی تھی جب مکہ آباد ہو چکا تھا، اسحاقؑ پیدا ہو چکے تھے، اور حضرت ابراہیمؑ پر اپنے باپ کے دشمن خدا ہونے کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔(۱)

ان دعاؤں کے مضامین پر غور کیا جائے تو ان سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ایک مومن کو اپنے رب سے کیسی دعائیں مانگنی چاہئیں؟ ان میں علم و حکمت، فہم و فراست، اور دانش مندی کی

(۱) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ..... والی دعا حضرت اسماعیلؑ کو بے آب و گیاہ وادی میں آباد کرتے وقت کی تھی۔ اس وقت مکہ آباد نہیں ہوتا تھا۔ اس صورت میں یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ دعا کا یہ جز مکہ آباد ہونے سے پہلے کا ہے اور باقی جز اس کے آباد ہو جانے کے بعد کا ہے۔ یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دعا کا اتنا حصہ حضرت اسماعیلؑ کو وادی میں آباد کرتے وقت کا ہو اور بعد میں مکمل دعا مکہ آباد ہو جانے کے بعد مانگی ہو۔ دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۲/۵۴۱، تفسیر کبیر ۵/۲۵۴

طلب ہے۔ اپنے گناہوں پر مغفرت کی استدعا ہے۔ آخرت میں ناکامی اور رسوائی سے بچانے کی التجا ہے۔ صالح جانشیں کی خواہش کا اظہار ہے۔ اور مادی اور روحانی بھلائیوں کی آرزو ہے۔ اگر مادی آسائش بھی طلب کی گئی ہے تو محض اس لیے کہ اس کے ذریعے شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہو۔

ان دعاؤں کا ایک دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ان سے دعا کرنے کا طریقہ اور اس کے آداب معلوم ہوتے ہیں۔ مفسرین نے ان میں سے بعض آداب کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ سورۂ شعراء آیات: ۸۳-۸۹ میں حضرت ابراہیمؑ کی جو دعا مذکور ہے اس سے پہلے انھوں نے تفصیل سے وہ احسانات گنائے ہیں جو ان پر اللہ تعالیٰ نے کیے ہیں۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ بارگاہ الٰہی میں دست طلب دراز کرتے وقت اس کے احسانات، اس کی بے پایاں نوازشوں اور کرم فرمائیوں کا واسطہ دینا چاہیے اور ان کے وسیلے سے دعا کرنی چاہیے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

> ''ان آیات میں پہلے حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کی ثنا بیان کی، پھر اس سے دعا کی اور اس کے سامنے دست سوال دراز کیا۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ دعا سے قبل اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنا اہمیت رکھتا ہے۔''(۱)

۲۔ حضرت ابراہیمؑ دعا کرتے وقت بار بار ''رَبِّ'' (اے میرے رب) ''رَبَّنَا'' (اے ہمارے رب) فرماتے ہیں۔ اس طرح رحمت الٰہی کو اپنی طرف منعطف کراتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں ایسے الفاظ استعمال کرنا پسندیدہ ہے۔ سورہ ابراہیمؑ آیات: ۳۴-۴۱ کے ذیل میں مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

> ''اس دعا میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سات مرتبہ(۲) رَبِّ یا رَبَّنَا کا لفظ آیا ہے۔ یوں بظاہر تو یہ ایک تکرار ہی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ چیز دعا کی خصوصیات بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے۔ دعا کا اصل مزاج تضرع، استمالت، استغاثہ اور التجا و فریاد ہے۔ یہ چیز مقتضی ہوتی ہے کہ جس سے دعا کی جارہی ہے اس کو بار بار متوجہ کیا جائے۔ جب بندہ خدا کو ربی سے خطاب کرتا ہے تو وہ گویا اس لطفِ خاص کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا تجربہ اسے خود ہے اور جب اس کو رَبَّنَا سے خطاب

---

(۱) تفسیر کبیر ۶/۲۱۵

(۲) مولانا اصلاحی سے گننے میں تسامح ہوا ہے۔ اس دعا میں رَبَّنَا پانچ مرتبہ اور رَبِّ تین مرتبہ آیا ہے۔ کل آٹھ مرتبہ۔

کرتا ہے تو وہ اس کے اس کرم عام کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا مشاہدہ تمام خلق میں ہو رہا ہے۔"(۱)

۳۔ دعا کا ایک ادب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس قسم کی دعا مانگی جائے اس کے مناسب صفات الٰہی کا استعمال کیا جائے۔ حضرت ابراہیمؑ دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں: "میرا رب ضرور دعا سنتا ہے" اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں پر معافی مانگتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتے ہیں: "تو بڑا معاف کرنے والا ہے۔"

۴۔ حضرت ابراہیمؑ جب دعا کرتے ہیں تو صرف اپنی ذات کو پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ اپنے والدین، اپنی نسل اور تمام اہل ایمان کی بھلائی کے بھی خواہاں رہتے ہیں۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل کو بھی مادی اور روحانی نعمتوں سے بہرہ ور کر دے۔ اس سے دعا کا ایک ادب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے ساتھ اپنے والدین اور اپنی نسل کی بھلائی کے لئے بھی دعا کرنی چاہیے، علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے:

"ہر دعا کرنے والے کو چاہیے کہ اپنے لئے دعا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد کے لئے بھی دعا کرے۔"(۲)

۶۔ عبادت گزاری

حضرت ابراہیمؑ جب زندگی کے ہر معاملہ میں مرضی رب کو پیش نظر رکھتے تھے اور اس کی اطاعت کی طرف سبقت کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ عبادت کے معاملے میں بھی وہ عالی مقام پر فائز ہوں گے۔ قرآن نے ان کی عبادت گزاری کا بانداز تحسین تذکرہ کیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ پر اپنے احسانات و انعامات گناتا ہے کہ ہم نے اسے اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا کیے۔ ان سب کو صالح بنایا اور انھیں امامت کے منصب پر فائز کیا (آیت: ۷۲) پھر فرماتا ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۟ۙ (الانبیاء: ۷۳)

اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعے نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

(۱) تدبر قرآن ۵۸۰/۴
(۲) تفسیر ابن کثیر ۵۴۰/۲

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کو دوسرے نیک کاموں کے ساتھ خاص طور پر نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا، جسے وہ ٹھیک ٹھیک بجالائے۔ عبادت گزاری کا اس سے بلند مقام اور کیا ہوسکتا ہے کہ خود معبود اس کی شہادت دے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے دوسرے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو بے آب وگیاہ وادی میں لا بسایا تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہاں وہ اور ان کی نسل پر سکون زندگی گزارتے ہوئے خدائے واحد کی عبادت کریں (ابراہیم: ۳۷) حضرت ابراہیمؑ اپنے رب سے اس کی توفیق کی دعا بھی مانگا کرتے تھے:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖ ق (ابرھیم: ۴۰)

پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں)

بائبل میں مواقع پر ''سرنگوں ہونے'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے مثلاً:

''خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں۔ تو میرے حضور چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد باندھوں گا اور تجھے بہت زیادہ بڑھاؤں گا۔ تب ابرام سرنگوں ہوگیا۔''(۱)

''اور خدا نے ابراہم سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے اس کو ساری نہ پکارنا۔ اس کا نام سارہ ہوگا اور میں اسے برکت دوں گا اور اس سے تجھے ایک بیٹا بخشوں گا۔ یقیناً میں اسے برکت دوں گا اور قومیں اس کی نسل سے ہوں گی اور عالم کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے۔ تب ابرام سرنگوں ہوا۔''(۲)

عین ممکن ہے کہ ''سرنگوں ہونے'' کی تعبیر نماز ہی کے لیے اختیار کی گئی ہو۔

خانۂ کعبہ کی دیواریں اٹھاتے وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا ''وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا'' (البقرہ:۱۲۸) اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انھیں حج کا طریقہ سکھایا۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ دوسرے لوگوں میں بھی اس کا اعلان عام کردیں (الحج:۲۷)

(۱) کتاب پیدائش باب ۱۷: ۱-۲

(۲) حوالہ سابق باب ۱۷: ۱۵-۱۷

۷۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک

والدین کے ساتھ حسن سلوک سیرت ابراہیمی کا ایک درخشاں باب ہے۔ حضرت ابراہیم نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو بت پرستی کا بازار گرم پایا۔ خود ان کا گھر بت پرستی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان کا باپ نہ صرف بت تراشتا تھا، بلکہ وہ پروہت کے منصب پر بھی فائز تھا۔ حضرت ابراہیم اپنی فطرت سلیم سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ مٹی پتھر کے یہ بت اس قابل نہیں کہ ان کے آگے جبین نیاز خم کی جائے۔ پھر جب انھیں بارگاہ الٰہی سے ''علم یقینی'' حاصل ہوا اور گمراہ انسانوں کو سیدھی راہ دکھانے کا حکم ملا تو سب سے پہلے انھوں نے اپنے باپ کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا۔ انھوں نے اس کا ادب واحترام ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی دل سوزی، محبت اور اپنائیت کے ساتھ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ فرمایا:

يَآاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَالاَ يَسْمَعُ وَلاَ يُبْصِرُ وَلاَ يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًاo يَآاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَ نِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا o يَآاَبَتِ لاَ تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ط اِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا o يَآاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّاo

(مریم: ۴۲-۴۵)

ابا جان آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابا جان میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابا جان آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔

ان آیات میں یا 'ابتِ' کی تکرار پر غور کیجیے۔ اس لفظ سے جو پیار، محبت، اپنائیت اور ادب واحترام مترشح ہے وہ عربی زبان کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں۔

امام رازیؒ ان آیات کے فنی محاسن آشکارا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ حضرت ابراہیم کے اس کلام کی ترتیب میں انتہائی حسن پایا جاتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنے باپ کو ان چیزوں کی طرف متوجہ کیا، جو بت پرستی کا

باطل ہونا واضح کرتی ہیں۔ اس کے بعد غور و تدبر کرنے اور اندھی تقلید سے اجتناب کرنے کے معاملے میں اپنی اتباع کی دعوت دی۔ پھر بتایا کہ شیطان کی اطاعت عقل مندوں کے لیے جائز نہیں ہے۔ آخر میں ایک ایسی وعید کا تذکرہ کیا جو انسان کو ناپسندیدہ کاموں سے روک دے۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ باتیں لطف و محبت کے پیرائے میں اور نرم لہجے میں کہیں۔ ان کا اپنی ہر بات کے شروع میں 'یَاأَبَتِ' کہنا اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ انھیں اپنے باپ سے شدید محبت تھی اور وہ اسے سزائے الٰہی سے بچانے اور راہ راست کی طرف لانے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ آخر میں انھوں نے فرمایا اِنِّی اَخَافُ (مجھے ڈر ہے) اس سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ اپنے باپ کے مفادات کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ باتیں کہنا متعدد وجوہ سے تھا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس طرح وہ اپنے باپ کے حقوق ادا کرنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اور دین کی طرف رہنمائی سے بڑھ کر حسن سلوک اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اگر اس کے ساتھ ادب و احترام بھی ملحوظ رکھا جائے اور بہت نرم لہجے میں یہ باتیں کہی جائیں تو یہ نور علی نور ہے۔"(۱)

حضرت ابراہیمؑ کی اس محبت، خیر خواہی اور دردمندی کا ان کے باپ کی جانب سے کیا جواب ملا؟ قرآن نے اس کو بھی بیان کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی ان باتوں کو سن کر وہ بہت چراغ پا ہوا۔ ترش لہجے میں دھمکاتے ہوئے کہنے لگا۔

اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ○ (مریم: ۴۶)

ابراہیمؑ کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے، اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگ سار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے الگ ہو جا۔

پیار، محبت اور ہمدردی و خیر خواہی کے جواب میں اپنے باپ کی سخت سست باتوں، ڈانٹ ڈپٹ، غصہ اور دھتکار کا حضرت ابراہیمؑ نے برا نہ مانا۔ بلکہ اسی دل سوزی کے ساتھ اسے سمجھاتے رہے۔ بالآخر جب انھوں نے محسوس کر لیا کہ اس کی سخت روی اور سنگ دلی کی بنا پر اب مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہی تو اس سے علاحدگی اختیار کر لینے ہی کو بہتر سمجھا۔ مگر اس موقع

(۱) تفسیر کبیر ۵/۵۶۲

پر بھی انھوں نے اپنے باپ پر واضح کر دیا کہ وہ اس کے گناہوں پر مغفرت اور اس کی ہدایت کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے رہیں گے۔

انھوں نے اس سے رخصت ہوتے وقت فرمایا:

سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ○

(مریم:۴۷)

سلام ہے آپ کو۔ میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔

سورہ مریم کی درج بالا آیت میں صرف، مغفرت کی دعا کرنے کے وعدے کا ذکر ہے۔ البتہ سورۂ ممتحنہ میں ہے کہ انھوں نے ساتھ ہی مزید یہ بھی فرمایا تھا:

وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ○ (الممتحنۃ:۴)

اور اللہ سے آپ کے لیے کچھ حاصل کر لینا میرے بس میں نہیں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس وعدہ کو پوری طرح نبھایا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد ایک موقع پر جب انھوں نے بارگاہ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تو باپ کی مغفرت بھی چاہی:

وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ○ۙ (الشعراء:۸۶)

اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں ہے۔

مکہ آباد ہو جانے کے بعد ایک موقع پر انھوں نے جو دعا کی تھی اس میں اپنے باپ کے ساتھ اپنی ماں کی مغفرت بھی طلب کی تھی:

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ○ع

(ابراھیم:۴۱)

پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جب کہ حساب قائم ہوگا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے باپ سے علاحدگی اور وطن سے ہجرت کے بعد ایک طویل عرصہ تک وہ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ہدایت یاب ہو اور اللہ کی رحمت و مغفرت اسے ڈھانپ لے۔ لیکن جب انھیں یقین ہو گیا کہ وہ رحمت الٰہی کا مستحق نہیں ہے تو اس کے لئے مغفرت کی دعا بند کر دی:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ (التوبۃ: ۱۱۴)

ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لئے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا۔

حضرت ابراہیمؑ پر کب اور کیسے واضح ہوا کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے اس لیے اس کی مغفرت کا مستحق نہیں ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین سے مختلف اقوال مروی ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جب تک وہ زندہ رہا حضرت ابراہیمؑ اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے رہے، لیکن جب بحالت شرک اس کی موت کا انھیں علم ہو گیا تو استغفار سے رک گئے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ استغفار سے اسی وقت رک گئے جب اللہ تعالیٰ نے انھیں خبر دی کہ اب اس پر حجت تمام ہو چکی ہے، وہ ایمان لانے والا نہیں ہے، اس لیے اس کا پیچھا چھوڑ دو۔''(۱)

۸۔ مہمان نوازی

حضرت ابراہیمؑ کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے مہمان نواز تھے۔ بعض روایات میں مہمان نوازی کو ان کی اوّلیات میں شمار کیا گیا ہے: اوّل من قری الضیف(۲) اول من اضاف الضیف(۳) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی مہمان کو اپنے ساتھ شریک کیے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ حتی کہ بعض اوقات مہمان کی تلاش میں دو دو میل تک نکل جاتے تھے۔(۴) حضرت ابراہیمؑ کی مہمان نوازی کے اثبات کے لئے ان روایات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ خود قرآن نے ان کی مہمان نوازی کو بڑے دل کش انداز میں بیان کیا ہے:

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۘ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۚ فَرَاغَ اِلٰٓى

(۱) تفسیر طبری ۵۲۳/۱۴، تفسیر کبیر ۵۲۷/۴، تدبر قرآن ۲۴۴/۳

(۲) البدایۃ والنھایۃ۔ ابن کثیر۔ ۱۶۳/۱

(۳) قصص الانبیاء۔ ثعلبی۔ ص ۸۷

(۴) حوالہ سابق ص ۱۰۴

اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝ فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ (الذاریات: ۲۴-۲۸)

اے نبی ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے؟ جب وہ اس کے یہاں آئے تو کہا: آپ کو سلام ہے اس نے کہا: آپ لوگوں کو بھی سلام ہے۔ کچھ ناآشنا سے لوگ ہیں۔ پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ایک (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لا کر مہمانوں کے آگے پیش کیا۔ اس نے کہا: آپ حضرات کھاتے کیوں نہیں؟ پھر وہ اپنے دل میں ان سے ڈرا۔ انھوں نے کہا: ڈریے نہیں اور اسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا۔

سورۂ ذاریات کے علاوہ یہ واقعہ سورۂ ہود (آیات:۶۹-۷۰) اور سورۂ حجر (آیات:۵۱-۵۳) میں بھی مذکور ہے۔ فرشتے حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں انسانوں کے بھیس میں گئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے انھیں اجنبی اور مسافر سمجھ کر ان کی خوب خاطر مدارات کی۔ اسی لئے قرآن نے ان کے لئے ضیف ابراھیم (ابراہیمؑ کے مہمان) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ نیز ان کی صفت مکرمین (معزز) بیان کی ہے۔ لفظ مکرمین سے اشارہ اس آؤ بھگت، خیر مقدم، تواضع اور ضیافت کی طرف ہے جس کا اہتمام حضرت ابراہیمؑ نے ان مہمانوں کے لئے فرمایا تھا۔(۱)

ان آیات سے جہاں ایک طرف یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے مہمانوں (خواہ وہ ان کے لئے اجنبی ہوں) کی کس قدر تواضع اور ان کے لئے کتنا اہتمام فرماتے تھے، وہیں ان سے آداب ضیافت کا بھی علم ہوتا ہے۔ مفسرین نے ان آداب کی طرف اشارہ کیا ہے۔(۲)

۱۔ مہمان خواہ کوئی بھی ہو اور کیسی بھی حیثیت کا مالک ہو، اس کے ساتھ اعزاز و اکرام کا معاملہ کرنا چاہیے۔ ابراہیمؑ بغیر یہ تحقیق کئے کہ یہ نووارد کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کیوں آئے ہیں؟ ان کی خاطر مدارات میں جٹ گئے تھے۔

۲۔ سلام کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آنے والا اس میں پہل کرے اور مخاطب اس کا بہترین طریقے پر جواب دے۔ فرشتے حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے سلام

---

(۱) تفسیر کبیر ۷/۲۴۱، کشاف ۴/۱۸، تدبر قرآن ۶/۶۰۶

(۲) دیکھئے تفسیر کبیر ۷/۶۴۳-۶۴۴، تفسیر ابن کثیر ۴/۲۳۵، کشاف ۴/۱۸

کیا اور حضرت ابراہیمؑ نے اس کا جواب دیا۔ قرآن میں اس موقعے کے جو الفاظ مذکور ہیں ان میں فرشتوں کا سلام نصب کی حالت میں (سلامًا) اور حضرت ابراہیمؑ کا جواب رفع کی حالت میں (سَلَامٌ) ہے۔ علمائے بیان نے لکھا ہے کہ محض اعراب بدل جانے سے حضرت ابراہیمؑ کے جواب میں زیادہ معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ اس لیے کہ رفع دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔(۱)

۳۔ مہمان کے لئے فوراً کچھ کھانے پینے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ممکن ہے دورانِ سفر اس نے کچھ کھایا پیا نہ ہو۔ حضرت ابراہیمؑ مہمانوں کا استقبال کرنے کے بعد فوراً ہی ان کے لئے کھانے کے انتظامات میں لگ گئے تھے۔ سورۂ ہود میں صراحت ہے: فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ (پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیمؑ ایک بھنا ہوا بچھڑا ان کی ضیافت کے لئے لے آیا)

۴۔ پھر یہ کہ میزبان کو چاہیے کہ کھانے پینے کے انتظامات مہمان سے چھپا کر کرے۔ یہ بڑی بداخلاقی ہے کہ مہمان سے پوچھا جائے: ''آپ کچھ کھائیں گے؟'' اسی طرح یہ چیز بھی آدابِ ضیافت کے خلاف ہے کہ یہ انتظامات مہمان کو دکھا کر یا اس کے علم میں لا کر کیے جائیں۔ اس لئے کہ اس صورت میں امکان ہے کہ مہمان تکلف کرتے ہوئے ایسا کرنے سے منع کر دے۔ قرآن کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مہمانوں کو بٹھا کر چپکے سے گھر کے اندر گئے تھے، تا کہ ان کے لئے کچھ کھانے کا نظم کر سکیں۔

۵۔ یہ چیز مناسب نہیں کہ ہر وقت مہمان کے ساتھ چپکے رہا جائے اور اسے ایک لمحے کے لئے بھی تنہا نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ اسے موقع دینا چاہیے کہ وہ حوائج ضروریہ سے فارغ ہو سکے، منہ ہاتھ دھو کر یا غسل کر کے تر و تازہ ہو سکے اور کچھ دیر آرام کر سکے۔ حضرت ابراہیمؑ بھی کچھ لمحے کے لئے مہمانوں کے پاس سے اٹھ گئے تھے۔

۶۔ میزبان کو چاہیے کہ مہمان کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق اچھے سے اچھا انتظام کرے۔ نو وارد حضرت ابراہیمؑ کے لئے اجنبی تھے، مگر انھوں نے ان کی ضیافت کے لیے ایک بچھڑا ذبح کر دیا۔ قرآن نے ایک جگہ عِجْلٍ حَنِيْذٍ (ہود:۶۹) اور دوسری جگہ عِجْلٍ سَمِيْنٍ (ذاریات:۲۶) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ عِجْلٍ سَمِيْنٍ سے اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کی ضیافت کے لیے اچھے سے اچھے جانور کا انتخاب کیا۔ اپنے ریوڑ میں سے دیکھ بھال کر

(۱) تفسیر ابن کثیر ۲/۴۵۱،۴/۲۳۵، تفسیر کبیر ۷/۶۴۲، مفردات اصفہانی ص ۲۳۹

خوب موٹا تازہ بچھڑا اچھانٹا۔ حنیذ کے دو معنی آتے ہیں۔ ایک معنی ہے بھنا ہوا، دوسرے معنی میں حنیذ اس گوشت کو کہتے ہیں جس سے روغن ٹپک رہا ہو۔(۱) دونوں میں سے کوئی بھی معنی اختیار کیا جائے، مقصود یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے اچھے جانور کا انتخاب کیا اور اسے ذبح کر کے اور لذیذ کھانا تیار کر کے مہمانوں کے سامنے پیش کیا۔

۷۔ میزبان کے کسی رویے سے یہ اظہار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مہمان کی خدمت کر کے اس پر کوئی احسان کر رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے مہمانوں کے سامنے کھانا پیش کر کے گزارش کے انداز میں فرمایا: اَلَا تَاْکُلُوْنَ ؟ (آپ حضرات کھاتے نہیں؟) انھوں نے کوئی حکمیہ جملہ نہیں کہا۔ یہ استفہامی انداز انھیں کھانے پر ابھارنے کے لئے تھا۔

۸۔ مہمان کے کھانے سے میزبان کو خوشی ہونی چاہیے۔ یہ بخیلوں کا شیوہ ہے کہ وہ مہمانوں پر خرچ نہیں کرتے۔ اور اگر کبھی ان کے یہاں کوئی مہمان آجائے تو وہ تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مہمانوں کو نہ کھاتا دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ ڈر گئے تھے۔ انھوں نے تو اس قدر اہتمام ان کی ضیافت طبع ہی کے لیے کیا تھا۔

۹۔ ضیافت کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ میزبان مہمان کو اپنے کسی ملازم یا ماتحت کے حوالے کر کے مطمئن نہ ہو جائے بلکہ خود اس کی دیکھ بھال کرے۔

۹۔ حلم و بردباری

سیرت ابراہیمی کا ایک نمایاں پہلو حلم و بردباری ہے۔ حلم سے مراد یہ ہے کہ آدمی غیظ و غضب کے موقعے پر اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھے اور کوئی شخص بدسلوکی کرے تو اس کے جواب میں صبر اور تحمل کا مظاہرہ کرے۔(۲) حضرت ابراہیمؑ میں یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ قرآن کریم میں دو مواقعے پر حضرت ابراہیمؑ کے دیگر اوصاف کے ساتھ اس صفت کا تذکرہ موجود ہے:

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ○ (التوبہ: ۱۱۴)

حق یہ ہے کہ ابراہیمؑ بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ○ (ھود: ۷۵)

(۱) کشاف ۲/۲۸۰، تفسیر کبیر ۵/۷۵، لسان العرب ۳/۳۸۴، مفردات اصفہانی ص ۱۳۳

(۲) مفردات اصفہانی ص ۱۲۸، کشاف ۲/۲۸۲

حقیقت میں ابراہیمؑ بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔

ان آیات کے سیاق وسباق میں غور کرنے سے اس وصف کی معنویت مزید آشکارا ہوتی ہے۔ سورۂ توبہ میں اس کا تذکرہ اس موقعے سے ہوا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ایک طویل عرصے تک اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہے۔ گزشتہ صفحات میں یہ بات آچکی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے جواب میں ان کے باپ نے سخت برہمی اور درشتی کا مظاہرہ کیا۔ ان کو جھڑکیاں اور دھمکیاں دیں، یہاں تک کہ ان کو گھر سے نکال کر دم لیا۔ مگر انھوں نے کسی طرح کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کی ڈانٹ ڈپٹ اور سخت سست باتوں کو برداشت کرتے رہے اور انتہائی دل سوزی اور پیار ومحبت سے اسے راہ حق کی تلقین کرتے رہے۔ وطن سے ہجرت کرنے کے بعد بھی وہ اس کی ہدایت سے مایوس نہیں ہوئے اور ایک طویل عرصے تک اس کی مغفرت کی دعا کرتے رہے۔ یہ رویہ ان کی صفت حلم پر دلالت کرتا ہے۔

دوسرا موقع وہ تھا جب انھیں مہمان بن کر آنے والے فرشتوں سے معلوم ہوا کہ اپنی نافرمانیوں، سرکشیوں اور بداعمالیوں کے سبب قوم لوط کی ہلاکت کا وقت قریب آگیا ہے۔ ایک ایسی قوم جو مسلسل بداعمالیوں کے سبب ہلاکت کی مستحق ہو چکی ہو، اس کی ہلاکت کی خبر کچھ باعث حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا جذبۂ حلم انھیں اس خبر پر بے چین کر دیتا ہے۔ وہ بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہو جاتے ہیں کہ بارالٰہا اس قوم کو کچھ اور مہلت عمل دے دے۔ ہوسکتا ہے وہ اپنا رویہ درست کرلیں۔ بائبل میں اس موقعے پر تفصیل مذکور ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیمؑ نے بار بار اللہ تعالیٰ کی جناب میں درخواست کی کہ اگر ان میں کچھ بھی راست باز بندے ہوں تو ان کی خاطر پوری قوم سے عذاب کو ٹال دے۔[1] قرآن نے اس موقع کی بڑی بلیغ منظرکشی کی ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ يٰٓاِبْرَاهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝ (ھود: ۷۴-۷۶)

(۱) دیکھئے کتاب پیدائش باب ۱۸: ۲۳-۳۲

پھر جب ابراہیمؑ کی گھبراہٹ دور ہوگئی اور اسے (اولاد کی) بشارت مل گئی تو اس نے قوم لوط کے معاملے میں ہم سے جھگڑا شروع کیا۔ حقیقت میں ابراہیمؑ بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا (آخر کار ہمارے فرشتوں نے اس سے کہا) اے ابراہیمؑ اس سے باز آجاؤ۔ تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور ان لوگوں پر وہ عذاب آکر رہے گا جو کسی کے پھیرے سے نہیں پھر سکتا۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ان آیات کی تشریح میں لکھا ہے:

''جھگڑے'' کا لفظ اس موقع پر اس انتہائی محبت اور ناز کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ اپنے خدا کے ساتھ رکھتے تھے۔ اس لفظ سے یہ تصویر آنکھ کے سامنے پھر جاتی ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان بڑی دیر تک ردّ و کدّ جاری رہتی ہے۔ بندہ اصرار کر رہا ہے کہ کسی طرح قوم لوط پر سے عذاب ٹال دیا جائے۔ خدا جواب دے رہا ہے کہ یہ قوم اب خیر سے بالکل خالی ہو چکی ہے اور اس کے جرائم اس حد سے گزر چکے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت کی جا سکے۔ مگر بندہ پھر بھی یہی کہے جاتا ہے کہ پروردگار اگر کچھ تھوڑی سی بھلائی بھی اس میں باقی ہو تو اسے اور ذرا مہلت دے دے۔ شاید کہ وہ بھلائی پھل لے آئے۔ بائبل میں اس جھگڑے کی کچھ تشریح بھی بیان ہوئی ہے۔ لیکن قرآن کا مجمل بیان اپنے اندر اس سے زیادہ معنوی وسعت رکھتا ہے۔''(۱)

حضرت ابراہیمؑ کے حلم اور بردباری کی مظہر ان کی وہ دعا بھی ہے جو انھوں نے اپنی ذریت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے کی تھی۔ اس میں یہ بھی ہے:

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

(ابراھیم: ۳۶)

جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگزر کرنے والا مہربان ہے۔

یہ دعا ان کی کمال درجہ نرم دلی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ کہنے میں کوئی حرج نہ تھا کہ ''جو میری نافرمانی کرے گا وہ آخرت میں اپنے برے انجام کو پہنچے گا'' لیکن ان کی زبان پر یہ جملہ نہ آسکا، بلکہ اس موقعے پر بھی انھوں نے یہی عرض کیا کہ اے اللہ تیری رحمت سے کچھ بعید نہیں۔ تو چاہے تو ایسے شامت کے ماروں سے بھی درگزر کر سکتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

(۱) تفہیم القرآن ۳۵۵/۲

"یہ حضرت ابراہیمؑ کی کمال درجہ نرم دلی اور نوع انسانی کے حال پر ان کی انتہائی شفقت ہے کہ وہ کسی حال میں بھی انسان کو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ آخر وقت تک عفو و درگزر کی التجا کرتے رہتے ہیں۔ رزق کے معاملے میں تو انھوں نے یہاں تک کہہ دینے میں دریغ نہ فرمایا: وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ:۱۲۶) اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے) لیکن جہاں آخرت کی پکڑ کا سوال آیا، وہاں ان کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ جو میرے طریقے کے خلاف چلے اسے سزا دے ڈالیو۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ ان کے معاملے میں کیا عرض کروں۔ تو غفور و رحیم ہے۔"(۱)

۱۰۔ صداقت شعاری

قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک صفت صداقت شعاری اور راست بازی بیان کی گئی ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِبْرَاهِيْمَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ (مریم: ۴۱)

اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو، بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔

"صدیق" کے مفسرین نے تین مفہوم بتائے ہیں۔ اس کا ایک مفہوم حق کی تصدیق کرنے والا(۲) اور دوسرا مفہوم آزمائشوں میں پورا اترنے والا ہے۔(۳) اسی مؤخر الذکر مفہوم میں سورۂ صافات میں قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا آیت:۱۰۵ (تو نے خواب سچ کر دکھایا) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کا تیسرا مفہوم جسے اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے،(۴) صداقت، شعار اور راست باز کے ہیں۔ صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ شخص جو ہمیشہ سچ بولتا ہو، کبھی اس کے منہ سے کوئی جھوٹی بات نہ سنی گئی ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کے لئے آنے والی اس صفت میں بڑی معنویت پائی جاتی ہے۔ ان کی حیات طیبہ کے بعض واقعات میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خلاف واقعہ بات کہہ کر جھوٹ بولا۔ قرآن کا مذکورہ بیان اس کی قطعی تردید کے لئے کافی ہے۔

---

(۱) تفہیم القرآن ۲/۴۸۹

(۲) تفسیر کبیر ۵/۵۶۰

(۳) تدبر قرآن ۴/۱۱۴

(۴) دیکھئے تفسیر طبری ۱۶/۵۹، کشاف ۲/۵۱۰، تفسیر کبیر ۵/۵۶۰

بعض احادیث میں حضرت ابراہیمؑ کی ان باتوں کو ''جھوٹ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت ہے:

لم یکذب ابراھیم الا ثلاثا(۱)

حضرت ابراہیمؑ کبھی جھوٹ نہیں بولے سوائے تین موقعوں کے

اس مضمون کی احادیث صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، معجم طبرانی، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند ابوعوانہ اور حدیث کی دیگر کتابوں میں مروی ہیں۔ ان کے سلسلہ میں علماء نے دو موقف اختیار کیے ہیں۔

۱۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ عربی زبان میں کذب ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں خلاف واقعہ معلوم ہو۔ اس کا اطلاق جس طرح جھوٹ پر ہوتا ہے اسی طرح توریہ پر بھی ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی وہ باتیں توریہ کے قبیل سے ہیں۔ اور توریہ اختیار کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ متقدمین میں حافظ ابن حجرؒ اور متاخرین میں مولانا امین احسن اصلاحی نے یہ تاویل اختیار کی ہے۔(۲)

۲۔ بعض دوسرے علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ روایات اگرچہ سنداً صحیح ہیں لیکن درایت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ راویوں کو جھوٹا قرار دینا جس قدر مشکل ہے اس سے بدرجہا مشکل یہ باور کرنا ہے کہ ایک نبی نے جھوٹ بولا ہوگا۔ ضرور کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک بات غلط صورت میں نقل ہوگئی ہے۔ متقدمین میں امام رازیؒ اور متاخرین میں مولانا مودودیؒ نے یہ توجیہ کی ہے۔(۳)

حضرت ابراہیمؑ کی حیات طیبہ کے یہ چند اہم اوصاف اور نمایاں خصوصیات ہیں جن کا مطالعہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنا خلیل بنایا، ان پر اپنے انعام واکرام کی بارش کی اور انھیں متعدد امتیازات سے نوازا۔ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی ہمارے لیے قابل تقلید نمونہ ہے جسے اختیار کر کے ہم بھی خوشنودیٔ رب سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ عزوجل واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا

(۲) فتح الباری، ابن حجر عسقلانی ۶/۳۹۱-۳۹۲، تدبر قرآن ۴/۳۰۰-۳۰۱

(۳) تفسیر کبیر ۶/۱۲۹، تفہیم القرآن ۳/۱۶۷-۱۶۸، رسائل و مسائل ۲/۳۲-۳۶

بابِ پنجم

سیرت ابراہیمؑ: چند شبہات کا جائزہ

حضرت ابراہیمؑ کو انبیاء کی تاریخ میں جس قدر عظمت اور شہرت حاصل ہے اسی قدر ان کی شخصیت کے بارے میں شکوک وشبہات بھی ظاہر کیے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ زمانۂ قدیم سے تا حال جاری ہے۔

بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کے درمیان منافست ایک تاریخی حقیقت ہے۔ بنی اسرائیل نے پوری کوشش کی کہ وہ تمام فضائل اپنی جانب منسوب کرلیں اور بنی اسماعیل کو ہر فضیلت سے محروم کر دیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے ان کی نسل کی کثرت کا جو وعدہ کیا تھا وہ بنی اسرائیل سے متعلق تھا۔ بنی اسماعیلؑ اس وعدے کے مستحق نہ تھے۔ اس طرح انھوں نے ذبیح (حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو اللہ تعالیٰ نے قربان کرنے کا حکم دیا تھا) حضرت اسحاقؑ کو قرار دیا اور حضرت ہاجرہ کو لونڈی اور ان کی ذریت کو لونڈی کی اولاد کہا۔ اس کوشش نے ان کی مذہبی کتاب کو قومی تاریخ کی کتاب بنا دیا۔ اس میں صرف انھیں چیزوں کا ذکر آسکا، جن کا ان سے براہ راست تعلق تھا اور جو چیزیں ان کی تاریخ وتہذیب سے متعلق نہ تھیں، بلکہ ان کا تعلق عرب یا کسی دوسری سرزمین سے تھا، وہ اس میں جگہ نہ پاسکیں۔ مثال کے طور پر اس میں حضرت ابراہیمؑ کی جزیرۃ العرب کی طرف ہجرت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح خانۂ کعبہ کی تعمیرِ ابراہیمی سے متعلق بھی اس سے کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ الغرض بنی اسرائیل کی پوری کوشش رہی ہے کہ بنی اسماعیل سے تمام فضائل چھین لیں۔ حضرت ابراہیمؑ سے ان کا تعلق منقطع کر دیں اور ان تمام چیزوں کو پردۂ خفا میں ڈال دیں، جن سے عربوں کی عظمت وشرف کا اشارہ ملتا ہو۔

عصر حاضر کے نام نہاد محققین بھی اسی روش پر گامزن رہے۔ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں بعض ایسے شکوک وشبہات پیدا کیے کہ عربوں کا ان سے کوئی تعلق ہی ظاہر نہ ہونے پائے اور ان کا ماضی ماقبل تاریخ کی تاریکیوں میں گم ہو جائے۔ ان میں سے بعض تو اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے سرے سے حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا انکار کر دیا اور انھیں ایک فرضی اور خیالی شخصیت قرار دینے لگے۔

گزشتہ صفحات میں حضرت ابراہیمؑ کی حیات طیبہ کے ضمن میں بعض اعتراضات اور شکوک سے بحث کی گئی ہے اور ان کا تفصیل سے جواب دیا گیا ہے۔ چند شبہات کا سطور ذیل میں جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا انکار

قرآن کریم میں جو قصے مذکور ہیں ان کے سلسلے میں بعض نام نہاد دانش وروں نے لکھا ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ تاریخی حیثیت سے بھی مستند ہوں اور عالم وجود میں واقع ہوئے ہوں، بلکہ وہ محض خیالی قصے بھی ہو سکتے ہیں، جن کے بیان کرنے کا مقصد محض بلاغی تاثیر اور عبرت ونصیحت ہو۔ یہ تو قرآنی قصوں کے بارے میں عموماً کہا گیا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کو نشانہ بناتے ہیں اور آسمانی کتابوں کی تردید وتکذیب کرتے ہوئے اس کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب ''فی الشعر الجاہلی'' میں لکھا ہے:

> ''تورات حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے بارے میں جو چاہے کہے، اسی طرح قرآن بھی ان دونوں کے بارے میں جو چاہے بیان کرے، مگر ان دونوں کا تورات اور قرآن میں مذکور ہونا ان کے تاریخی وجود کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، چہ جائیکہ اس سے وہ قصہ ثابت کیا جائے جس سے اسماعیل وابراہیمؑ کی مکہ کی طرف ہجرت کا اشارہ ملتا ہے''(۱)

بعض عقلیت زدہ روشن خیال لوگوں کا کہنا ہے کہ ابراہیمؑ پرانے زمانے کی کوئی متعین شخصیت اور علَم نہیں ہے بلکہ یہ شیخ القبیلہ کا لقب ہوا کرتا تھا۔ مولانا عبد الماجد دریابادی کے الفاظ میں:

---

(۱) فی الشعر الجاہلی۔ طٰہٰ حسین

''جہل و بے خبری بھی عجیب چیز ہے اور دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ وحی کے منکر ہوتے ہیں وہ خود علم و عقل کے بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔ زیادہ نہیں چالیس ہی پچاس برس پہلے کی بات ہے کہ روشن خیالی نے حضرت ابراہیمؑ کے وجود ہی سے انکار کر دیا تھا اور یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس نام کی کوئی شخصیت ہی نہیں گزری ہے اور یہ تو نوعی نام شیخ قبیلہ کا ہے۔''(۱)

قرآن کریم اگرچہ تاریخ کی کوئی کتاب نہیں جو قدیم حوادث اور گزشتہ واقعات کی ترجمانی کرتی ہو۔ بلکہ وہ آسمانی کتاب ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے اور انھیں صراط مستقیم کی طرف دعوت دینے کے لیے نازل فرمایا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ خرافات اور اساطیر کے قبیل سے ہیں اور حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن نے واقعات و حکایات بیان کرنے میں حق و صداقت سے کام نہیں لیا ہے ان کے پاس اس مفروضے کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ بہت سے قصے ایسے ہیں جو نہ کتاب مقدس میں مذکور ہیں اور نہ یہود کی دیگر کتب ہی میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ مگر قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اس چیز کو بنیاد بنا کر دشمنان اسلام نے یہ شبہ پیدا کرنا شروع کر دیا کہ قصص قرآنی محض وہم و خیال پر مبنی ہیں۔ ان کا وقوع عالم وجود میں نہیں ہوا ہے۔ ان کو بیان کرنے کا مقصد صرف بلاغی تاثیر ہے۔ لیکن جدید تحقیقات اور قدیم تاریخ دونوں سے ان شبہات کی تردید ہوتی ہے اور ان واقعات کا حقیقی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر عاد اور ثمود کا قصہ کتاب مقدس میں مذکور نہیں۔ صرف قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے، ان کی تہذیب و ترقی بیان کی ہے، اور ان کی ہلاکت کا نقشہ کھینچا ہے۔ چنانچہ قرآن میں شک و شبہ پیدا کرنے والوں نے ان قصوں کو خیالی اور خرافاتی کہنا شروع کر دیا۔ بالآخر وہ وقت آیا جب کہ جغرافیہ بطلیموس نے ان کی تصدیق کر دی۔ اس میں عاد (OADITA) اور ثمود (THAMUDITA) کا نام آیا ہے اور ان کا محل وقوع مملکت اسرائیل سے قریب بتایا گیا ہے۔

یہی حال ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی شخصیتوں کا ہے۔ بغیر کسی دلیل کے ان کا انکار کرنا اور انھیں خرافاتی قرار دینا علمی امانت و دیانت کے سراسر خلاف ہے۔ جبکہ اس کے برعکس اسلامی، یہودی، مسیحی اور دیگر بہت سے مراجع حضرت ابراہیمؑ کا تاریخی وجود ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح

(۱) قصص و مسائل، عبدالماجد دریابادی، ص ۱۱

آپ کا ذکر تاریخ کی قدیم کتابوں میں بھی آیا ہے، مثلاً یوسیفوس یہودی (جو پہلی صدی مسیحی سے تعلق رکھتا ہے) اپنی تاریخ میں کہتا ہے:

''مورخ برسوس نے ہمارے باپ ابراہیم کا تذکرہ کیا ہے۔ البتہ آپ کے نام کا ذکر نہیں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ طوفان کے بعد دسویں پشت میں، کلدانیوں کے مابین ایک راست باز شخص رہتا تھا جو علوم سماویہ میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ مورخ ہکتا تورس (تیسری صدی قبل مسیح) نے مزید یہ بتایا ہے کہ اس نے ان کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ نقولا دمشقی اپنی تاریخ کی چوتھی کتاب میں کہتا ہے: ''ابرامیس نے دمشق میں حکومت کی، اس نے دمشق میں حملہ کر کے حکومت حاصل کی تھی، وہ بابل کی سرزمین سے اس ملک میں آیا تھا جسے کلدانیوں کا ملک کہتے تھے۔ دمشق میں وہ زیادہ عرصہ نہیں رکا، وہاں سے ہجرت کر کے وہ اپنی قوم کے ساتھ کنعان کے ملک میں پہنچا (جسے آج کل یہودا کہتے ہیں) وہیں اس کی نسل پھلی پھولی اور پروان چڑھی۔ اس کے بارے میں دوسری کتاب میں تذکرہ کروں گا۔ ابرام کا نام دمشق کے ملک میں بعد میں عرصہ تک مشہور رہا۔ اس علاقہ میں ایک گاؤں کا نام مسکن ابرام ہے۔''[1]

دراصل قرآنی قصوں میں شبہ پیدا کرنے والے، ہر اس واقعے کی تردید میں سرعت دکھاتے ہیں، جس کا تعلق خوارق و معجزات سے ہو۔ مثلاً جب قرآن کہتا ہے کہ فلاں شہر یا فلاں بستی کو اللہ تعالیٰ نے اس کی سرکشی اور فساد کی بنا پر ہلاک کر دیا تو یہ لوگ فوراً اس قصے کی تردید کرنے لگتے ہیں کہ اس بستی کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں۔ اس کا فتنہ وفساد محض جھوٹ اور خیالی ہے۔ اس کی طرف کوئی نبی نہیں بھیجا گیا۔ پورا قصہ خرافات اور خیال کے قبیل سے ہے۔

لیکن آثار قدیمہ کی کھدائی سے حاصل ہونے والی جدید تحقیقات سے ان تمام چیزوں کی تصدیق ہوگئی اور وہ تمام چیزیں منصۂ شہود پر آ گئی ہیں، جو ایک صدی قبل لوگوں کی نگاہوں سے مخفی تھیں۔ مثلاً ماہرین آثار قدیمہ نے عراق، اردن، سواحل بحر احمر اور جنوب عرب میں صحراء احقاب میں جو کھدائی کی ہے اس سے یہ حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ قوموں کی ہلاکت ایک ثابت شدہ امر ہے۔ جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ یہ سرزمینیں زلزلوں، زمینی جھٹکوں اور فضائی حوادث کی سرزمینیں ہیں اور ان کا زمانہ بھی تقریباً وہی ہے، جو دینی

(۱) ابراہیم ابوالانبیاء۔ عباس محمود العقاد ص ۱۵۲

تواریخ میں بیان کیا گیا ہے۔ان اہم تحقیقات اور کھدائیوں میں سے ایک وہ ہے جسے اس اثری ٹیم نے انجام دیا تھا جو برٹش میوزیم اور امریکہ کی PENNSY LOUANIA کے مشترکہ سرمایہ پر ۱۹۲۲ء میں بابل کے آثار قدیمہ کی کھدائی کے لیے عراق بھیجی گئی تھی۔اس نے سات سال تک اپنا کام جاری رکھا۔اس ٹیم کی قیادت سر لیونارڈ وولی (SIR LEONARD WOLLEY) کر رہے تھے۔[1] سات سال کی مسلسل محنت اور تگ ودو میں اس ٹیم نے 'اُر' کا پورا شہر دریافت کرلیا، جو کہ حضرت ابراہیمؑ کا جائے پیدائش ہے اور اس کی ترقی یافتہ تہذیب، وہاں کے باشندوں کی، علوم وصناعات میں ترقی اور تجارت میں قریبی ملکوں سے تعلقات وغیرہ کے بارے میں بھی تفصیلی اور تحقیقی معلومات فراہم کردیں۔اس مہم کو سر کرنے کے بعد سر لیونارڈ وولی نے دو کتابیں لکھیں۔ ایک کا نام 'ابراہام' (ABRAHAM) اور دوسری کا کلدانیوں کا ار (UR OF CHALDEANS) ہے۔ان میں وولی نے اپنی مہم میں حاصل ہونے والی تحقیقات واکتشافات کا ذکر کیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں کلدانیہ کی علمی وصنعتی ترقی، دینی ومذہبی حالت، رسوم ورواج، سیاسی حالات اور پڑوسی ملکوں سے تعلقات اور وہ تمام چیزیں بیان کی ہیں جو ایک ترقی یافتہ تہذیب میں پائی جاتی ہیں۔

اس اثری تحقیق کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا انکار مہمل اور بے معنی ہو جاتا ہے جس کی، دلائل کی دنیا میں کوئی وقعت نہیں۔[2]

۲۔قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا ارتقا

بعض مستشرقین نے ایک دعویٰ یہ کیا ہے کہ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت ارتقاء

(۱) قصص ومسائل۔عبدالماجد دریابادی۔ص ۱۱۲

(۲) اسی شبہ کی تردید میں عباس محمود العقاد نے ایک ضخیم کتاب "ابراہیم ابوالانبیاء" لکھی ہے جس میں انھوں نے اسلام، یہودیت، مسیحیت، صابئیت کے دینی مراجع، ہیرودوتس، یوسیفورس اور دوسرے قدیم مورخین کے تاریخی مراجع اور جدید اثری تحقیقات کی روشنی میں پورے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ ابراہیمؑ کی ایک تاریخی حیثیت ہے جس کا ذکر تمام قابل ذکر مراجع میں ملتا ہے۔اسی طرح انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی حیات کے تمام واقعات ـــــ اُر سے حران کی طرف ہجرت، حران سے کنعان کی طرف ہجرت، کنعان سے مصر کی طرف ہجرت اور آخر میں مکہ کی طرف ہجرت اور وہاں خانۂ کعبہ کی تعمیر وغیرہ ـــــ کو قرین عقل ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس زمانے کے حالات اسی ترتیب اور ایسے ہی واقعات کے متقاضی تھے۔

کے مراحل طے کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مکی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کسی اور صورت میں ملتا ہے اور مدنی سورتوں میں کسی اور طریقے سے۔ مشہور مستشرق ونسنک (WENSINCK) کہتا ہے:

اسپرنگر (SPRENGER) پہلا شخص ہے، جس نے محسوس کیا کہ قرآن میں ابراہیمؑ کی شخصیت مختلف مراحل طے کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں کعبہ کے بانی کی حیثیت سے نمودار ہوتی ہے۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد "سنوک ہجرونیہ" نے اس دعوے کو کچھ تفصیل سے بیان کیا۔ اس نے کہا کہ جو سورتیں ابتدائی زمانے میں نازل ہوئیں مثلاً الذاریات آیت ۲۴ و مابعد، الحجر آیت ۵۰، و مابعد، الصافات آیت ۸۴ و مابعد، الانعام آیت ۷۴ و مابعد، ہود آیت ۷۲ و مابعد، مریم آیت ۴۲ و مابعد، الانبیاء آیت ۵۲ و مابعد، العنکبوت آیت ۱۵ و مابعد، ان میں ابراہیمؑ دوسرے رسولوں کی طرح محض ایک رسول کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جو اپنی قوم میں انذار کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ان سورتوں میں حضرت اسماعیلؑ کا ان سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس کے ساتھ بعض سورتوں میں یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قبل عرب میں کوئی ڈرانے والا رسول مبعوث نہیں ہوا (السجدہ آیت ۲، سبا آیت ۴۳، یسین آیت ۶) ان سورتوں میں کہیں مذکور نہیں کہ ابراہیمؑ بیت اللہ کے بانی و موسس ہیں اور نہ یہ کہ وہ پہلے مسلمان ہیں۔ اس کے برخلاف مدنی سورتوں میں معاملہ برعکس ہے۔ ان میں ابراہیمؑ کو 'حنیف' 'مسلم' اور 'ملت' ابراہیمی کا بانی قرار دیا گیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسماعیلؑ کے ساتھ بیت اللہ الحرام (کعبہ) کی بنیاد اٹھائی (البقرہ آیت ۱۱۸ و مابعد، آل عمران ۶۰، ۸۴ وغیرہ)

حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کے بارے میں اس اختلاف اور تعارض کا راز یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکہ میں یہود پر بھروسہ کیا، مگر جلد ہی انھوں نے ان کے خلاف دشمنی کی سازشیں شروع کر دیں، چنانچہ ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ کسی کو اپنا حامی و مددگار بنائیں۔ یہاں ان کی سلیم الفطرت ذہانت نے انھیں ابوالعرب ابراہیمؑ کی ایک نئی حیثیت سمجھائی۔ اس طرح انھوں نے اپنے زمانے کی

یہودیت سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنا تعلق ابراہیمؑ کی یہودیت سے جوڑ لیا وہ یہودیت جس نے اسلام کے لیے راہ ہموار کر دی اور چونکہ مکہ رسول کے غور وفکر کا مرکز تھا اس لیے ابراہیمؑ کو اس شہر کے مقدس گھر کا بانی قرار دیا گیا"

اسپرنگر اور سنوک نے یہ ثابت کرنے میں پورا زور صرف کر دیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا اہل عرب سے کوئی تعلق نہیں ہے اور قرآن نے انھیں جن خصائص و امتیازات سے متصف کیا ہے، ان کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں، جنھیں انھوں نے اپنے دین کو پھیلانے اور مقبول عام بنانے کے لیے گھڑ لیا تھا۔ ان کے اس شبہ سے کہ اہل عرب کا حضرت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں تھا آگے بحث کی جائے گی۔ یہاں ان کے دیگر شبہات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ انھوں نے قرآن کو بنیاد بنا کر یہ شبہ پیدا کرنا چاہا ہے کہ مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کو حنیف، مسلم، ملت ابراہیمی کا بانی اور بیت اللہ کا موسس بتلایا گیا ہے اور حضرت اسماعیلؑ کو ان کا فرزند قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ مکی سورتوں میں ان باتوں کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اس طرح انھوں نے یہ تاثر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ فی الواقع حضرت ابراہیمؑ کو یہ سب خصوصیات و امتیازات حاصل نہ تھیں۔ مگر مدینہ ہجرت کرنے کے بعد مخصوص سیاسی حالات کے سبب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی یہ سب حیثیتیں گھڑ کر پیش کیں اور ان کو اہل عرب کا جدامجد قرار دیا۔

مکی اور مدنی سورتوں کا حوالہ دے کر انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے اس جائزہ میں پوری طرح غیر جانب دار ہیں اور علمی امانت و دیانت سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب ہم اس شبہ کا علمی تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کے پیچھے زبردست تعصب کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انھوں نے لوگوں کو اس دھوکے میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسماعیلؑ سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ حالانکہ خود بائبل حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسماعیلؑ سے رشتہ ثابت کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے تھے، جو اسحاقؑ سے چودہ سال بڑے تھے۔ ان حضرات کی امانت و دیانت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں صرف ان سورتوں کا حوالہ دیا ہے، جن سے بظاہر ان کی رائے کی تائید ہوتی تھی اور ان سورتوں کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی، جو علی الاعلان

صراحت سے حضرت ابراہیمؑ کا اہل عرب سے تعلق ثابت کرتی ہیں۔ عصبیت نے انھیں اس حد تک اندھا کر دیا کہ وہ اس مکی سورت کو بھی نہ دیکھ سکے جو ''ابراہیمؑ'' کے نام سے موسوم ہے۔ یعنی ''سورۂ ابراہیم'' جس میں ان کے پیدا کردہ تمام شبہات کا جواب ہے۔ اس سورت میں ایک منظر پیش کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ عرب میں ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے فرزند اسماعیلؑ بھی ہیں۔ وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ مکہ کو اس کے لیے امن و سلامتی کا گہوارہ بنا دے اور اس بے آب و گیاہ وادی میں انھیں ثمرات سے لطف اندوز فرما، وہ آیات یہ ہیں:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۗ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ۝ (ابراھیم:۳۵-۳۹)

پروردگار، اس شہر (مکہ) کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے۔ جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگزر کرنے والا مہربان ہے۔ پروردگار میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصہ کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے۔ شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔ پروردگار تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمانوں میں۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے بیٹے دیے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔

یہ آیات واضح طور پر دلالت کرتی ہیں کہ ابراہیمؑ بیت اللہ کے بانی ہیں۔ اسی طرح ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیلؑ ان کے فرزند ہیں۔

یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ ابراہیمؑ کو مکی سورتوں میں 'حنیف مسلم' نہیں کہا گیا ہے۔ سورہ نحل جو مکی ہے اس میں ہے:

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ (النحل: ۱۲۰)

واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا۔ اللہ کا مطیع فرمان اور یکسو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔

اس سورت میں آگے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو ملت ابرہیمی کی اتباع کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہے:

ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (النحل: ۱۲۳)

پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۚ (الانعام: ۷۹)

میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اسی سورت میں ایک جگہ ہے:

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الانعام: ۱۶۱)

اے نبی! کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں۔ ابراہیمؑ کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

تعجب ہے کہ ان حضرات کو مکی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں حنیف مسلم کی صراحت کیسے نظر نہیں آئی؟

دراصل قرآن کے اسالیب میں سے ایک اسلوب یہ ہے کہ وہ موقع و مناسبت اور مخاطب کے عقل و ذوق کی رعایت کرتا ہے۔ ابراہیمؑ کا قصہ بہت سی سورتوں میں مذکور ہے مگر کہیں پورا قصہ یکجا نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے مختلف اجزاء مختلف سورتوں میں ضرورت، مناسبت اور مخاطب کی رعایت سے بیان کیے گئے ہیں۔ کسی سورت میں کوئی جزء ہے تو کسی سورت میں کوئی دوسرا جزء۔ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سورتوں میں اختلاف ہے البتہ جو لوگ قرآن کے اس اسلوب سے ناواقف ہیں وہ اسے اختلاف ہی سمجھیں گے۔ ایک چیز یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مکی سورتیں اور مدنی سورتیں اسلوب کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ مکی سورتوں میں اختصار اور اجمال کو مدنظر رکھا گیا ہے اور ان میں صرف بنیادی عقائد بیان کیے گئے ہیں جبکہ مدنی سورتوں میں احکام شریعت کا ذکر ہے اور انھیں بسط و تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ عہد مکی میں مخاطبین صرف مشرکین تھے جبکہ عہد مدنی میں قرآن کے مخاطبین میں یہود و نصاریٰ میں شامل ہو گئے۔ مکی سورتوں اور مدنی سورتوں کا مطالعہ کرتے وقت ان چیزوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

سورۂ سجدہ، سورۂ سبا اور سورۂ یٰسٓ کی آیات سے یہ استدلال کہ حضرت محمد ﷺ سے قبل عرب میں کوئی نبی نہیں مبعوث ہوا، صحیح نہیں۔ قرآن نے یہ بات مشرکین کے اس دعویٰ کی تردید میں کہی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ انھیں توحید کی طرف دعوت دیتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس پہلے سے آباؤ اجداد کا دین موجود ہے:

قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ (الاعراف:۲۸)

کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

قرآن نے ان کے باطل عقائد کا پردہ فاش کیا اور کہا کہ تمہارے ان عقائد کے ساتھ نہ تو کوئی نبی بھیجا گیا اور نہ کوئی کتاب نازل کی گئی۔

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ۙ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(الصافات:۱۵۶-۱۵۷)

یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو۔

اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ (الاحقاف: ۴)

کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا بھی کہ وہ ہستیاں ہیں کیا جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انھوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں کی تخلیق وتدبیر میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اس سے پہلے آئی ہوئی کوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ تمہارے پاس ہو تو وہی لے آؤ۔

ان آیتوں کا ایک مطلب یہ بھی بتا گیا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے بعد اہل مکہ کی طرف کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا، اس لیے کہ وہ حق پر قائم اور ہدایت یافتہ تھے۔ یہاں تک کہ جب ان میں شرک پھیلنا شروع ہوا، تب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔

یہ کہنا کہ ''محمد نے مکہ میں یہود پر بھروسہ کیا'' بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں ان امور میں، جن کے بارے میں کوئی وحی نازل نہ ہوتی تھی، یہود کی شریعت کے مطابق عمل کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اہل کتاب میں سے تھے اور آپ کو ان امور میں انہی کی شریعت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نماز میں بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے۔ اور وہ مسلمانوں کے نزدیک بھی مقدس تھا۔ لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا ہے کہ آپ مکہ میں یہود پر بھروسہ کرتے اور ان سے مدد ونصرت کے خواہاں رہتے تھے۔ تاریخ تو یہ ثابت کرتی ہے کہ عہد مکی میں آنحضرتؐ کا یہود سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جب آپ نے مدینہ ہجرت کی تو یہود سے محبت و بھائی چارگی کا معاہدہ کیا۔ لیکن یہود نے معاہدہ کی رعایت نہ کی، بلکہ دشمنی میں مشرکین سے بھی بڑھ گئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے ان کی مخالفت کا حکم دیا۔

اسی طرح یہ بات کہ ''محمدؐ نے اپنا تعلق ایک نئی یہودیت سے جوڑ لیا جو ابراہیمؑ کی یہودیت ہے'' ویسی ہی لغو بات ہے جیسی یہود ونصاریٰ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں کہا کرتے تھے کہ ابراہیمؑ یہودی اور نصرانی تھے۔ آخر کیسے ممکن ہے کہ ابراہیمؑ یہودی ہوں اور یہودیت کو ابراہیمؑ کی طرف منسوب کیا جائے، جبکہ تورات حضرت ابراہیمؑ کے ایک عرصہ بعد نازل ہوئی ہے۔

یہودیت کی نسبت یہودا ابن یعقوبؑ کی طرف ہے اور یعقوبؑ حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ پھر آخر حضرت ابراہیمؑ یہودیت کے تابع کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ قرآن کریم نے اس عجیب وغریب دعویٰ کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (آلِ عمران:۶۵-۶۷)

اے اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے (دین کے) بارے میں کیوں جھگڑا کرتے ہو۔ تورات اور انجیل تو ابراہیمؑ کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟! تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو ان میں تو خوب بحثیں کر چکے۔ اب ان معاملات میں کیوں بحث کرنے چلے ہو جن کا تمہارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی۔ بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

مستشرقین کے اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے محمد فرید وجدی نے لکھا ہے:

''اگر حضرت محمد ﷺ کو اسلام کے لیے راہ ہموار کرنے کے لیے اپنا رشتہ دین ابراہیمی سے جوڑنا ہی تھا تو بہتر تھا کہ آپ مکہ ہی میں ایسا کرتے۔ کیونکہ وہاں جتنے قبائل آباد تھے سب کے سب حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھے۔ مدینہ پہنچ کر ایسے لوگوں کے درمیان دین ابراہیمی سے رشتہ جوڑنا جو یمن سے تعلق رکھتے تھے اور جن کا حضرت ابراہیمؑ سے کوئی نسبی تعلق نہیں تھا، دانشمندی کے تقاضے کے خلاف تھا''(۱)

۳۔ حضرت ابراہیمؑ کا اہل عرب اور خانۂ کعبہ سے تعلق

بعض مستشرقین نے اپنی ''تحقیقات'' سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت

(۱) دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد اول مقالہ ''ابراہیم'' پر فرید وجدی کا حاشیہ، ص ۲۹

ابراہیمؑ کا عرب سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کبھی مکہ تشریف لائے نہ انھوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی۔ بلکہ دراصل کعبہ کی تاریخ مجہول ہے۔

اس کا دعویٰ اسپرنگر اور سنوک نے کیا اور کہا کہ یہ تصور محمدؐ کے ذہن کی اختراع ہے۔ جب آپ مدینہ آئے اور وہاں یہود نے مخالفت کی تو آپ نے اپنے زمانے کی یہودیت سے چھٹکارا پانے کے لیے ابراہیمؑ کو ایک نئی حیثیت سے پیش کیا اور انھیں ابوالعرب اور موسس کعبہ قرار دیا۔ جیسا کہ ہم پہلے ان کا شبہ نقل کر چکے ہیں۔

اسی طرح سر ولیم میور (SIR WILLIUM MEUR) نے کہا ہے:

"کعبہ کی اصل اور مکہ کے مقامی مذہب کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دونوں حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہیں۔ وہ بعض عادات اور رسموں کو اس قصے سے جوڑتے ہیں جو بائبل میں بیان ہوا ہے۔ لیکن دراصل یہ ایک فرضی کہانی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ مکہ اور اس کے دین کا آغاز ویسے ہی ہوا ہو جس طرح مسلمان کہتے ہیں۔ کیونکہ ان رسومات میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جسے ابراہیمؑ کی طرف منسوب کیا جا سکے، مثلاً تقبیل حجر اسود، طواف کعبہ اور مکہ، عرفات اور منیٰ میں ادا ہونے والی دوسری رسمیں۔ اسی طرح بعض مہینوں کی تحریم اور حرم کا احترام وغیرہ۔"(۱)

پھر آخر روایتوں میں حضرت ابراہیمؑ کا حجاز کی طرف آنا کیوں مذکور ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے میور لکھتا ہے:

"یہ قصہ اسلام سے چند پشت قبل یہود نے گڑھا ہے، تاکہ وہ اپنے اور اہل عرب کے درمیان رشتہ استوار کر لیں جس سے اہل عرب ان یہود کے ساتھ جو ان کے درمیان آباد تھے اچھا برتاؤ کریں اور حسن سلوک سے پیش آئیں اور جزیرۂ عرب میں یہود کو اپنی تجارت وسیع کرنے میں آسانی ہو۔"(۲)

اپنے دعوے پر وہ یہ دلیل بھی قائم کرتا ہے کہ عرب کے دینی ماحول اور دین ابراہیم میں کوئی تعلق نہیں، کیونکہ عرب کا ماحول خالص مشرکانہ تھا جبکہ ابراہیم حنیف مسلم تھے۔

(۱) لائف آف محمد۔ سر ولیم میور۔ مقدمہ کا تیسرا باب، جس میں میور نے مکہ کے دین کی قدامت کے بارے میں بحث کی ہے۔
(۲) سر ولیم میور، حالہ سابق

اسی طرح بعض مستشرقین نے خانۂ کعبہ کا تعلق بھی حضرت ابراہیمؑ سے منقطع کرنے کی کوشش کی ہے، مگر مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اس کوشش میں خود ان ہی کے درمیان باہم تضاد پایا جاتا ہے۔ بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ خانۂ کعبہ کا ذکر قدیم تاریخوں میں بھی ملتا ہے اس لیے وہ آپ کا تعمیر کردہ نہیں ہوسکتا، تو بعض دوسرے مستشرقین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کا قدیم تاریخ میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے بہت زمانہ کے بعد تعمیر ہوا۔ مستشرقین کے پہلے گروہ میں سر ولیم میور قابل ذکر ہے۔ موخر الذکر گروہ میں سے مارگولیتھ کہتا ہے:

"قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا..... اگرچہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البناء قرار دیا ہے، لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی۔"(۱)

اس طرح موصوف نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مکہ حضرت ابراہیمؑ کے بہت زمانہ کے بعد آباد ہوا۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا مکہ آنا مبنی بر حقیقت نہیں۔

ڈوزی کہتا ہے۔

"حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں شمعونیوں نے (جنھیں مورخین بنو جرہم کے نام سے یاد کرتے ہیں) کعبہ کی تعمیر کی۔"(۲)

جہاں تک حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے عرب میں آنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ تورات خاموش ہے، بلکہ اس میں واقعات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا عرب سے کوئی تعلق ہی ظاہر نہ ہو۔ کتاب پیدائش میں ہے کہ حضرت ہاجرہ سے اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی، بعد میں حضرت سارہ کے بطن سے اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ اسماعیلؑ جب بڑے ہوئے تو حضرت سارہ نے یہ کہہ کر کہ "وہ ٹھٹھے مارتا ہے" حضرت ابراہیمؑ سے حضرت ہاجرہ اور اسماعیل کو گھر سے نکال دینے کو کہا۔ چنانچہ:

"ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اس کے کندھے پر رکھ دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیرسبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی..... اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مارگولیتھ کا مقالہ 'محمد'، جلد ۷/ص ۳۹۹

(۲) المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام۔ جواد علی جلد ۴/ص ۱۲

اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لیے بیوی لی.....''(۱)

بائبل کے اس بیان پر مولانا مودودیؒ تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''یہ پوری جھوٹی داستان اس لیے گھڑی گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا عرب، مکہ، کعبہ اور زمزم سے کوئی تعلق سرے سے ظاہر ہی نہ ہو، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کے سفر عرب پر بالکل پردہ ڈال دینے اور حضرت اسماعیل کے چودہ برس تک فلسطین میں قیام اور اس کے بعد بیابان فاران میں ان کے رہنے اور وہیں پانی کا کنواں برآمد ہونے اور مصر کی کسی عورت سے ان کی شادی ہونے کا ذکر اسلام کی تاریخ کے اس پورے باب پر خطِ نسخ پھیر دیتا ہے جس کا تعلق دین ابراہیمی کے عربی مرکز سے ہے۔ بائبل میں فاران کے بیان کا جو ذکر مختلف مقامات پر کیا گیا ہے اس کی رو سے وہ فلسطین کے جنوب، وادیٔ عربہ کے مغرب، دشت سینا کے شمال اور مصر و بحر روم کے مشرق میں واقع تھا۔ عرب کے جبال فاران سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا جن میں مکہ واقع ہے۔''(۲)

تورات کی مذکورہ بالا تصریحات جیسی بھی ہوں۔ ان سے کم از کم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ نے فاران کے بیابان میں سکونت اختیار کی۔ ''فاران'' کے بارے میں عیسائی اور مسلمان مصنفین میں شدید اختلاف رہا ہے۔ عیسائی فاران اس مقام کو قرار دیتے ہیں، جو جزیرہ نمائے سینا کے مغرب میں، مصر سے متصل ہے۔ بعض کوہ سینا کے دامن کو اس کا محل وقوع قرار دیتے ہیں۔ جب کہ مسلمان مصنفین اسے عرب میں قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ معجم البلدان میں تصریح ہے کہ فاران حجاز کے پہاڑ کا نام ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عرب، حجاز، مکہ، کعبہ یہ جتنے الفاظ و اسماء ہیں اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ لفظ عرب دسویں صدی ق م میں پیدا ہوا ہے (دیکھو جغرافیہ بطلیموس) حجاز کا لفظ اس سے بھی زیادہ مستحدث ہے۔ مکہ کا نام دوسری صدی مسیحی میں بطلیموس کے یہاں سب سے پہلے ''مکارہا'' کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اسی لیے تورات نے اس مقام کا نام

(۱) کتاب پیدائش باب ۲۱: ۱۴-۲۱

(۲) سیرت سرور عالم، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ۲/۵۴

"مدبار" (بادیہ) بتایا ہے اور قرآن نے اسی کو "وادغیر ذی زرع" (بن کھیتی کی زمین) کہا، کہ اس کے سوا اس کا اس وقت کوئی دوسرا نام نہ تھا۔ مدت کے بعد یہی لفظ بادیہ وصحرا اور وادی غیر ذی زرع اور عرب ہم معنی لفظ ہو گئے، اس لیے تورات کا یہ کہنا کہ اسماعیل نے بادیہ میں سکونت اختیار کی، اس کے بالکل یہ معنی ہیں کہ اس نے عرب میں سکونت اختیار کی۔"(۱)

کتاب پیدائش میں بنی اسماعیل کی جائے سکونت کے بیان میں یہ مذکور ہے:

"اور اس کی اولاد حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے جس سے اشور کو جاتے ہیں آباد تھی"۔(۲)

اور مصر کے سامنے اس تحدید کے مطابق جو علاقہ تھا وہ عرب ہی ہو سکتا ہے۔

ایک اشارہ عہد نامہ جدید میں گلتیوں کے نام پولس کے خط کی ایک عبارت سے بھی ملتا ہے:

"ابرہام کے دو بیٹے تھے۔ ایک لونڈی سے دوسرا آزاد سے، مگر لونڈی کا بیٹا جسمانی طور پر اور آزاد کا بیٹا وعدہ کے سبب سے پیدا ہوا۔ ان باتوں میں تمثیل پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ عورتیں گویا دو عہد ہیں۔ ایک کوہ سینا پر کا جس سے غلام ہی پیدا ہوتے ہیں اور وہ ہاجرہ ہے اور ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے"۔(۳)

ہاجرہ کو عرب کا کوہ سینا قرار دینے کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

عقل سلیم بھی حضرت ابراہیم کے مکہ آنے کی تائید کرتی ہے۔ آپ نے محض اللہ کے دین کی اشاعت کے لیے گھر بار چھوڑا۔ عراق سے ہجرت کی۔ حران میں کچھ دن قیام کر کے شام آگئے اور فلسطین میں قیام کیا۔ پھر مصر گئے۔ آپ نے ہر جگہ لوگوں کو خدا کی طرف بلایا۔ مگر مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے دام میں گرفتار لوگوں نے کم ہی دھیان دیا۔ اس لیے یہ بات عین مقتضائے عقل اور قرین قیاس ہے کہ حضرت ابراہیم نے ایسے علاقوں کی تلاش کی ہو جو ان تہذیبوں اور مذاہب کے اثرات سے آزاد ہوں۔ اس بات کو مزید تقویت اس بات سے ملتی ہے کہ مکہ یمن سے شام جانے والی شاہراہ پر واقع تھا۔ جنوب عرب سے شام جانے والے قافلے اسی

(۱) ارض القرآن، سید سلیمان ندوی، ۲/۴۷

(۲) کتاب پیدائش باب ۲۵:۱۸

(۳) عہد نامہ جدید، گلتیوں کے نام پولس کا خط باب ۴:۲۴-۲۵

راہ سے ہو کر گزرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ تاریخوں میں آتا ہے کہ مکہ (جو اس زمانہ میں آباد نہیں ہوا تھا) ایک تجارتی اسٹیشن تھا، جہاں شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال جانے والے قافلے آکر ٹھہرتے تھے اور وہاں آرام کر کے پھر اپنا سفر شروع کرتے تھے۔(۱) اسی لیے یہ ظن غالب یقین کے درجے تک پہنچ جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ، جو سفر کے عادی تھے اور سیکڑوں ہزاروں میل کا سفر طے کر چکے تھے، اس شاہراہ سے بھی واقف ہوں اور اس پر سفر کرنے والے قافلوں تک پیغام حق پہنچانے کی خواہش ان کے دل میں پیدا ہوئی ہو۔ اور اس خواہش کے تحت انھوں نے اس مشہور تجارتی اسٹیشن میں اپنی اولاد کو لا بسایا ہو اور جیسا کہ خود بائبل سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جہاں بھی تشریف لے جاتے تھے وہاں ایک قربان گاہ اور معبد تعمیر کرتے تھے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ اس جگہ بھی ایک معبد تعمیر کیا ہو اور جب کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے عرب جانے اور عبادت گاہ تعمیر کرنے کے سلسلے میں تاریخ سے بھی اشارے ملتے ہیں اور قرآن کریم بھی پورے جزم و یقین سے صراحت کرتا ہے تو محض وہم و گمان کی بنیاد پر اسے رد کر دینا خلاف عقل و منطق ہے۔

اس تاریخی واقعے کا انکار محض اس بات سے ممکن نہیں کہ عرب کا دینی ماحول اس کی تائید نہیں کرتا۔ میور کی اس رائے کی تردید کرتے ہوئے محمد حسین ہیکل کہتے ہیں:

> ''حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی وفات کے صدیوں بعد عرب میں پائی جانے والی بت پرستی اور شرک سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اہل عرب حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کے زمانے میں بھی مشرک رہے ہوں۔ اگر ہم بالفرض اس زمانے میں بھی بت پرستی اور شرک کا وجود مان لیں تو اس سے میور کی تائید نہیں ہوتی۔ کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعوت ان میں عام نہ ہو سکی ہو۔ ان کے بت پرستی نہ چھوڑنے سے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے عرب جانے کی تردید کہاں ہوتی ہے؟''(۲)

میور کا حضرت ابراہیمؑ کے مکہ آنے کو ایک فرضی کہانی قرار دینا بالکل بے بنیاد ہے۔ تعجب ہے کہ میور کو تقبیل حجر اسود، طواف کعبہ اور مکہ، عرفات اور منیٰ میں ادا ہونے والی رسموں

---

(۱) مکہ والمدینۃ فی الجاھلیۃ وعہد الرسول ص ۹۹

(۲) حیاۃ محمد، محمد حسین ہیکل، ص ۸۹

میں حضرت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں دکھائی دیتا۔ حالانکہ یہ تمام رسمیں حضرت ابراہیمؑ کی یاد کی تجدید اور خدا کی بارگاہ میں بجالانے والے اعمال اور قربانیوں کی یادگار ہیں۔

شریعت ابراہیمی میں دستور تھا کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھاتے تھے یا خدا کے لیے نذر کرتے تھے وہ بار بار معبد یا قربانی کے پھیرے کرتا تھا۔ حج میں خانۂ کعبہ کا طواف اسی شریعت ابراہیمی کی یادگار ہے۔ منٰی میں کی جانے والی قربانی حضرت ابراہیمؑ کے اس عمل کی یادگار ہے کہ آپ خواب میں وحی الٰہی کا اشارہ پاتے ہی اپنے لختِ جگر کو قربان کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی اس کیفیت کی یادگار ہے جس کا اظہار حضرت اسماعیلؑ کو پیاس سے تڑپتا دیکھ کر حضرت ہاجرہ سے اضطراری طور پر ہوا تھا۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ کہتے ہیں:

"کعبہ کی تعمیر کے بعد جب سے حج کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے زمانے میں شروع ہوا، اس وقت سے آج تک سیکڑوں پھر ہزاروں پھر لاکھوں پھر کروڑوں انسان اس واقعہ کی یاد میں سعی بین الصفا والمروہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ ہزاروں برس کا متواتر عمل جو بلا انقطاع اس وقت سے آج تک ہو رہا ہے، اس واقعہ کا ایسا ثبوت ہے جس سے بڑھ کر کسی تاریخی واقعہ کا ثبوت دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس بائبل بیابان فاران کا جو واقعہ بیان کرتی ہے وہاں نہ پہلے کبھی اس طرح کی سعی ہوئی نہ آج ہو رہی ہے۔"(۱)

دراصل میور کو یہ سب ماننے میں پریشانی یہ ہے کہ وہ ذبیح حضرت اسحاقؑ کو مانتے ہیں اور قربان گاہ مکہ میں مروہ کے بجائے فلسطین میں مورہ یا موریا کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح اور مروہ کا قربان گاہ ہونا اس حد تک واضح ہو چکا ہے کہ کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

مکہ مکرمہ اور خانۂ کعبہ کا تذکرہ خواہ قدیم تاریخوں میں ہو یا نہ ہو، اس سے نفسِ واقعہ کی تردید نہیں ہوتی، کیونکہ عدمِ علم عدمِ وجود پر دلالت نہیں کرتا۔ مکہ کی قدامت ثابت کرتے ہوئے میور نے جن تاریخوں کا حوالہ دیا ہے وہ سب کی سب حضرت ابراہیمؑ سے بہت بعد کی ہیں۔ سب سے قدیم شہادت جس میں مکہ کا تذکرہ ملتا ہے ہیرودوتس کی ہے، جو چوتھی صدی قبل مسیح کا مورخ ہے اور اگر ہم خانۂ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ سے قبل بھی مان لیں تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر نہیں کی اور وہ مکہ کبھی نہیں آئے۔ بعض تاریخی روایتوں سے

(۱) سیرت سرور عالم۔ مولانا مودودی ۲/۵۷ (حاشیہ)

معلوم ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ سب سے پہلے حضرت آدم نے تعمیر کیا تھا۔ طوفان نوح میں اس کی عمارت زمین بوس ہو گئی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی مدد سے اسے دوبارہ تعمیر کیا۔ قرآن میں ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمَاعِيْلُ.

(البقرہ:۱۲۷)

اور یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔

''دیواریں اٹھانے'' سے اشارہ ملتا ہے کہ بنیاد پہلے سے موجود تھی۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اس پر دیواریں کھڑی کر کے عمارت تیار کر دی۔

دوسری طرف ماگولیتھ نے یہ کہہ کر کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی، یہ شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مکہ کی آبادی اور کعبہ کا قیام حضرت ابراہیمؑ کے بہت زمانہ بعد عمل میں آیا۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ مورخین نے جا بجا تصریح کی ہے کہ چونکہ اہل عرب کعبہ کے بالمقابل یا آس پاس عمارتیں بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے پختہ عمارتیں نہیں بنوائیں تھیں، بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے۔ اس طرح مکہ ہمیشہ خیموں کا ایک وسیع شہر تھا'' اور سب سے پہلی عمارت سعید بن عمرو نے بنوائی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مکہ میں پہلے آبادی ہی نہیں تھی۔ (۱)

(۱) سیرت النبی۔ علامہ شبلی نعمانی۔ ۱/۱۵۳

کتابیات

۱۔ قرآن کریم

۲۔ عہد نامہ قدیم وجدید

۳۔ برناباس کی انجیل، ترجمہ آسی ضیائی، مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۹۸۲ء

تفسیر

(الف) عربی

۴۔ احکام القرآن۔ ابو بکر ابن العربی۔ تحقیق علی محمد البجاوی۔ دار احیاء الکتب العربیہ قاہرہ ۱۹۵۷ء

۵۔ انوار التنزیل واسرار التاویل (تفسیر بیضاوی) ابو سعید بیضاوی۔ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند

۶۔ تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر) ابن کثیر۔ المکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر ۱۹۳۷ء

۷۔ جامع البیان عن تاویل آی القرآن (تفسیر طبری) محمد بن جریر طبری
طبع قدیم: المطبعۃ المیمنیۃ مصر
طبع جدید: دار المعارف مصر

۸۔ الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی) ابو عبد اللہ قرطبی۔ الہیئۃ المصریہ العامۃ للکتاب مصر ۱۹۸۷ء

۹۔ روح المعانی۔ السید محمود آلوسی۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر

۱۰۔ زاد المسیر فی علم التفسیر۔ ابن الجوزی۔ المکتب الاسلامی بیروت ۱۹۸۷ء

۱۱۔ فی ظلال القرآن۔سید قطب۔دار الشروق بیروت ۱۹۸۸ء
۱۲۔ الکشاف عن حقائق التنزیل۔ جار اللہ زمخشری۔ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ مصر ۱۹۷۲ء
۱۳۔ لباب التاویل فی معانی التنزیل (تفسیر خازن) علاؤ الدین خازن۔ مطبعہ التقدم العلمیہ مصر
۱۴۔ معالم التنزیل (تفسیر بغوی) برحاشیہ تفسیر خازن
۱۵۔ مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر) فخر الدین رازی۔المطبعۃ العامرۃ مصر ۱۳۰۸ھ

(ب) اردو

۱۶۔ تدبر قرآن۔امین احسن اصلاحی۔تاج کمپنی دہلی ۱۹۸۹ء
۱۷۔ ترجمان القرآن۔ابوالکلام آزاد۔ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۱۹۶۸ء
۱۸۔ تفسیر القرآن (تفسیر ماجدی) عبدالماجد دریابادی۔مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۱۹۹۵ء
۱۹۔ تفہیم القرآن۔سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

حدیث وشروح حدیث

۲۰۔ جامع ترمذی
۲۱۔ سنن ابی داؤد
۲۲۔ شرح السنہ۔بغوی۔المکتب الاسلامی بیروت ۱۹۸۳ء
۲۳۔ صحیح بخاری
۲۴۔ صحیح مسلم
۲۵۔ فتح الباری بشرح صحیح البخاری۔ابن حجر العسقلانی۔دار المعرفۃ بیروت
۲۶۔ مسند احمد۔المطبعہ المیمنیہ مصر
۲۷۔ موطا امام مالک

تاریخ

(الف) عربی

۲۸۔ اتجاہ الموجات البشریۃ فی جزیرۃ العرب

۲۹۔ الاخبار الطوال۔ ابوحنیفہ الدینوری۔ مطبع بریل لیدن ۱۸۸۸ء

۳۰۔ اخبار مکہ۔ ابوالولید الازرقی۔ مکتبہ خیاط بیروت ۱۹۶۴ء

۳۱۔ البدایۃ والنہایۃ (تاریخ ابن کثیر) ابن کثیر۔ دارالریان للتراث مصر

۳۲۔ تاریخ الرسل والملوک (تاریخ الطبری) محمد بن جریر طبری۔ دارالمعارف مصر ۱۹۷۹ء

۳۳۔ تاریخ الیعقوبی۔ دارصادر بیروت ۱۹۶۰ء

۳۴۔ التاریخ القدیم

۳۵۔ الحضارۃ المصریۃ۔ غوستاف لوبون۔ عربی ترجمہ صادق رستم۔ المطبعۃ المصریۃ قاہرہ

۳۶۔ خطط الشام۔ محمد کرد علی۔ مطبعۃ المفید دمشق ۱۹۲۸ء

۳۷۔ العرب قبل الاسلام۔ جرجی زیدان۔ دارالہلال قاہرہ

۳۸۔ العرب واطوارہم

۳۹۔ الکامل فی التاریخ۔ ابن الاثیر الجزری۔ دارالکتاب العربی بیروت ۱۹۸۶ء

۴۰۔ کتاب التیجان فی ملوک حمیر۔ ابن ہشام۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ دکن ۱۳۴۷ھ

۴۱۔ مروج الذہب ومعادن الجوہر۔ ابوالحسن مسعودی۔ مطبعۃ الشرق الاسلامیہ قاہرہ

۴۲۔ المعارف ابن قتیبہ مطبعۃ دارالکتاب قاہرہ

۴۳۔ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام۔ جواد علی۔ دارالعلم للملایین بیروت ۱۹۶۹ء

۴۴۔ مکۃ والمدینۃ فی الجاہلیۃ وعہد الرسول

(ب) اردو

۴۵۔ تاریخ ارض القرآن۔ سید سلیمان ندوی۔ مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۹۵۶ء

۴۶۔ تاریخ ملل قدیمہ

۴۷۔ سواء السبیل فی سکان وادی النیل

۴۸۔ مصر کی قدیم تاریخ۔ رولن (اردو ترجمہ)

سیر وسوانح

(الف) عربی

۴۹۔ ابراہیم ابوالانبیاء۔ عباس محمود العقاد

۵۰۔ حیاۃ محمدؐ۔ محمد حسین ہیکل۔ قاہرہ ۱۹۵۲ء

۵۱۔ سیرۃ النبی۔ ابن ہشام۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر ۱۹۳۷ء

۵۲۔ قصص الانبیاء۔ عبدالوہاب نجار۔ شرکتہ مساہمۃ مصریۃ۔ مصر ۱۹۵۳ء

۵۳۔ قصص الانبیاء المسمّٰی بعرائس المجالس۔ ابواسحاق الثعلبی۔ داراحیاء الکتب العربیہ قاہرہ

(ب) اردو

۵۴۔ انبیائے قرآن۔ مولانا عبدالرحمٰن۔ ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور

۵۵۔ الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ۔ سرسید احمد خاں۔ طبع نول کشور اسٹیم پریس لاہور

۵۶۔ رحمتہ للعالمین۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۱ء

۵۷۔ سیرت سرور عالم۔ ابوالاعلیٰ مودودی مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۱ء

۵۸۔ سیرت النبیؐ (اول) شبلی نعمانی۔ مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۰ء

۵۹۔ سیرت النبیؐ (پنجم) سید سلیمان ندوی۔ مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۰ء

۶۰۔ قصص القرآن۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۰ء

۶۱۔ قصص ومسائل۔ عبدالماجد دریابادی۔ اسلامک پبلشرز لکھنؤ ۱۹۹۴ء

عقائد وفرق (عربی)

۶۲۔ اظہار الحق۔ رحمت اللہ کیرانوی۔ تحقیق عمر الدسوقی۔ طبع قطر

۶۳۔ الصابئۃ قدیماً وحدیثاً۔ السید عبدالرزاق الحسنی۔ المطبعہ الرحمانیہ مصر ۱۹۳۱ء

۶۴۔ الملل والنحل۔ الشہرستانی۔ بہ حاشیہ الملل والاہواء والنحل۔ ابن حزم

لغات

(الف) عربی

۶۵۔ لسان العرب۔ ابن منظور۔ دار بیروت للطباعہ والنشر بیروت ۱۹۵۵ء

۶۶۔ المفردات فی غریب القرآن۔ راغب اصفہانی۔ دارالمعرفہ بیروت

(ب) اردو

۶۷۔ لغات القرآن (پنجم) سیّد عبدالدائم جلالی۔ ندوۃ المصنفین دہلی

متفرقات

(الف) عربی

۶۸۔ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء۔ شاہ ولی اللہ دہلوی

۶۹۔ التکمیل فی اصول التاویل۔ عبدالحمید الفراہی۔ الدائرۃ الحمیدیہ ومکتبتہا۔ سرائے میر اعظم گڑھ ۱۳۸۸ھ

۷۰۔ دائرۃ المعارف۔ پطرس بستانی۔ مطبعۃ المعارف مصر ۱۸۷۷ء

۷۱۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (انسائکلو پیڈیا آف اسلام کا عربی ترجمہ) میں مقالہ ''ابراہیم'' پر فرید وجدی کا حاشیہ۔ جلد اول قاہرہ ۱۹۳۳ء

(ب) اردو

۷۲۔ آں حضرت ﷺ کا سلسلۂ نسب اور اہل کتاب۔ حمید الدین فراہی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۹۱ء

۷۳۔ تفہیمات (دوم) سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

۷۴۔ حضرت ہاجرہ۔ اردو بازار اسٹیم پریس امرتسر ۱۹۱۱ء

اس کتاب میں دو کتابچے شامل ہیں:

۱۔ النصوص الباہرۃ فی حریۃ ہاجرہ۔ مولانا عنایت رسول چریا کوٹی

۲۔ النصوص الظاہرۃ فی حریۃ ہاجرہ۔ مولوی چراغ علی

۷۵۔ ذبیح کون ہے؟ حمید الدین فراہی۔ اردو ترجمہ امین احسن اصلاحی۔ دائرۂ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ

۷۶۔ رسائل ومسائل (جلد دوم) سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

۷۷۔ مقالات سلیمان (سوم) سید سلیمان ندوی۔ مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۹۷۱ء

مقالات

۷۸۔ اسوۂ ابراہیمی۔ محمد رضی الاسلام ندوی۔ ششماہی مجلہ علوم القرآن علی گڑھ۔ جنوری تا دسمبر ۱۹۹۵ء

۷۹۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت۔ مراحل، عناصر اور طریقہ کار۔ محمد رضی الاسلام ندوی۔ ماہنامہ راہ اعتدال عمر آباد مارچ ۱۹۹۹ء

۸۰۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں مستشرقین کے شبہات۔ محمد رضی الاسلام ندوی۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ۔ جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء

۸۱۔ حضرت اسماعیلؑ اور یہود۔ محمد رضی الاسلام ندوی۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ۔ جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء

۸۲۔ داستان خلیل۔ ابوالجلال ندوی۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۱ء

۸۳۔ لفظ 'امتہ' کی تحقیق۔ احمد حسن فرحات۔ ترجمہ محمد رضی الاسلام ندوی۔ ششماہی مجلہ علوم القرآن علی گڑھ۔ جولائی۔ دسمبر ۱۹۸۷ء

۸۴۔ ملت ابراہیمی اور اسلام۔ محمد رضی الاسلام ندوی۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ۔ اپریل۔ جون ۱۹۹۹ء

۸۵۔ ملت ابراہیمی کے ترکیبی عناصر۔ محمد رضی الاسلام ندوی۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ۔ جنوری۔ مارچ ۱۹۸۹ء

۸۶۔ مناسک حج کی تاریخ۔ محمد رضی الاسلام ندوی۔ ماہنامہ حیات نو اعظم گڑھ۔ مئی تا جولائی ۱۹۸۷ء

۸۷۔ ہلال خصیب اور وادیٔ سندھ۔ خواجہ عبدالرشید۔ ماہنامہ برہان دہلی۔ مئی ۱۹۴۵ء

ابراہیم علیہ السلام کی پکار

اسلام کی دعوت: حج کی منادی

[مولانا سید محمد داؤد غزنوی نور اللہ مرقدہٗ]

موجودہ زمانے کے علوم وتمدن کی یہ سب سے بڑی برکت بتائی جاتی ہے کہ نقل وحمل کے وسائل اور سیر وحرکت کے حیرت انگیز ذرائع نے قوموں اور ملکوں کا تفرقہ دور کر دیا ہے۔ بحر و بر کے ڈانڈے مل گئے ہیں اور ساری دنیا ایسی ہوگئی ہے جیسے ایک مسلسل آبادی کے مختلف محلے اور حصے ہوتے ہیں۔

لیکن اس پر بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملکوں کا بُعد جس قدر کم ہوتا جاتا ہے اور قوموں کو ایک دوسرے کے قریب کی آسانیاں مہیا ہو رہی ہیں، دل اور دماغ کا تفرقہ اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ جس قدر تیزی سے بیسویں صدی کی موٹریں دوڑ رہی ہیں اور ہوائی جہاز فضائے آسمانی میں تیر رہے ہیں، اتنی ہی تیزی سے قوموں کے دل بھی ایک دوسرے سے دُور برگشتہ ہو رہے ہیں۔

لیکن آج سے تیرہ سو برس پہلے جب دنیا موجودہ زمانے کے تمام ذرائع نقل وحمل اور وسائل قرب واجتماع سے محروم تھی، بحر احمر کے کنارے، ریگستانِ عرب کے وسط میں حجاز کی وادیٔ ''غیر ذی زرع'' ایک چٹیل اور بے زراعت وادی کے اندر ایک صدائے اجتماع بلند ہوئی اور نسل انسانی کے منتشر افراد کا ایک نیا گھرانہ آباد کیا گیا۔ انسانی اجتماع کی یہ پکار صرف اتنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ ملکوں کی سرحدیں اور جغرافیہ کی حدیں ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں، بلکہ اس کا مقصد نسل انسانی کے بکھرے ہوئے گھرانوں، پھٹے ہوئے دلوں اور برگشتہ روحوں کو ایک دوسرے سے جوڑنا تھا۔ یہ پکار سنی گئی۔ کرۂ ارض کے سارے گوشوں، خشکی اور تری کی ساری راہوں سے اس پکار کی بازگشت بلند ہوئی۔ انجن اور بجلی کی تیز رفتار سواریوں کے ذریعہ، تار اور لاسلکی کے گاڑے ہوئے ستونوں پر سے نہیں، بلکہ دل کے اعتقاد اور روح کے ایمان کے

ذریعہ اس کی پکار سب نے سنی اور اس کی پکار کا جواب سب کی زبانوں سے نکلا۔

☆...... یہ ابراہیم علیہ السلام کی پکار تھی۔ ☆...... یہ اسلام کی دعوت تھی۔ ☆...... یہ فریضۂ حج کی منادی تھی کہ جس نے ملکوں کو اکٹھا کر دیا، قوموں کو جوڑ دیا، نسل اور زبان و مکان کے سارے تفرقے دور کر دیے، گورے کو کالے کے ساتھ اور بادشاہ کو فقیر بے نوا کے ساتھ ایک ہی مقام میں، ایک ہی وضع ولباس میں، ایک ہی ایمان و اعتقاد کے ساتھ اس طرح جمع کر دیا کہ انسان کے بنائے ہوئے سارے امتیازات مٹ گئے اور انسانی اخوت اپنی اصلی صورت میں بے نقاب ہوگئی۔

ذرا آنکھیں بند کر کے اپنے دل میں اس نقشے کا تصور تو کیجیے کہ ادھر مشرق سے، ادھر جنوب سے، اُدھر مغرب سے، ادھر شمال سے اَن گنت قوموں اور بے شمار ملکوں کے لوگ ہزاروں راستوں سے ایک ہی مرکز کی طرف چلے آرہے ہیں۔ شکلیں اور صورتیں مختلف ہیں۔ رنگ مختلف ہیں، زبانیں مختلف ہیں مگر مرکز کے قریب ایک خاص حد تک پہنچتے ہی اپنے اپنے قومی لباس اتار دیتے ہیں اور سارے کے سارے ایک ہی طرز کا سادہ یونیفارم پہن لیتے ہیں۔ احرام کا یہ یونیفارم پہننے کے بعد علانیہ یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ سلطانِ عالم اور شاہ زمین و آسمان کی یہ فوج جو کہ دنیا کی ہزاروں قوموں سے بھرتی ہو کر آرہی ہے، ایک ہی بادشاہ کی فوج ہے، ایک ہی کی اطاعت و بندگی کا نشان اسی پر لگا ہوا ہے۔ ایک ہی وفاداری کے رشتے میں یہ سب بندھے ہوئے ہیں۔

تیرہ سو برس سے زائد عرصہ ہو گیا کہ دنیا ہر سال یہ نظارہ دیکھتی ہے کہ مختلف بولیوں کے بولنے والے مختلف رنگوں، مختلف نسلوں کے لوگ سمندروں کو عبور کر کے، پہاڑوں کو طے کر کے کئی مہینوں کی مسافت چل کر، دنیا کے مختلف گوشوں سے قافلے حجاز کی مقدس سرزمین پر اس موسم میں خود بخود بغیر کسی خاص انتظام کے پہنچتے ہیں۔ کیا دنیا کے کسی اور حصہ میں بھی ایسا منظر نظر آسکتا ہے؟ کیا اس منظر سے بھی بڑھ کر کوئی منظر ہے جو انسانی اجتماع کی ایک حیرت انگیز قوت کا پتہ دے؟

میں جب یہ سوچتا ہوں کہ کس کے ہاتھوں میں اس رشتہ کا سرا ہے جس پر سے بحر و بر کے یہ تمام گوشے کھینچ لیے جاتے ہیں تو مجھ پر عالم کیف طاری ہو جاتا ہے اور میں بے ساختہ پکار اٹھتا ہوں کہ اس رشتہ کا سرا اسلام کے ہاتھ میں ہے اور میرا دل پورے یقین اور اذعان کے ساتھ یہ

صدا بلند کرتا ہے کہ چھٹی صدی کے صحرائے عرب کا اسلام آج بھی انسانی اخوت کی سب سے بڑی زندہ قوت ہے۔

حج کی تیاری:

چار ہزار برس سے زیادہ عرصہ گزرا جب کہ سریر آرائے مسند خلقت اور پیشوائے عالمیان حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام عراق کی سرزمین میں پیدا ہوئے جہاں کلدانیوں کی حکومت تھی۔ اس زمانے میں اگرچہ یہ دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم تھی، لیکن انہیں اتنی بھی بصیرت اور سوجھ بوجھ نہ تھی کہ سورج، چاند، ستارے مخلوق اور زوال پذیر ہیں، یہ کبھی بھی معبود اور حاجت روا اور مشکل کشا نہیں ہو سکتے، یہ لوگ ستاروں اور بتوں کی پوجا کرتے۔ ان میں نجوم، فال، رمل، جادو، ٹونے وغیرہ کا چرچا خوب تھا۔ ہندوؤں میں جس طرح پنڈت اور برہمن ہیں، اس زمانہ میں بھی پجاریوں کا ایک گروہ تھا جو قسم قسم کے ڈھونگ رچاتا۔ عوام ان کے پھندے میں بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ انہی پجاریوں کو وہ اپنی قسمت کا مالک سمجھتے تھے اور انہی کی نیاز مندیوں میں اپنی دولت اور ساری عمر صرف کر دیتے تھے، ادنیٰ کسان سے لے کر بادشاہ تک، سب ہی ان کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے کیونکہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کیے رکھنا چاہیے۔ یہ چاہیں تو ہم پر رحمت و برکت ہو، یہ چاہیں تو ہم پر دیوتاؤں کی عنایت ہو، وگرنہ ہم طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مگر ابراہیم، کون ابراہیم! جسے اللہ نے فرمایا: ﴿إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾ ''اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم لے کر حاضر ہوا۔'' وہ ابراہیم جس کی بے مثال وفا شعاریوں پر فرمایا: ﴿إِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى﴾ وفادار ابراہیم، جس نے ہوش سنبھالتے ہی غور و فکر کیا کہ یہ سورج، چاند اور ستارے جو ایک مقررہ پروگرام کے مطابق گردش کرتے ہیں۔ پتھر کے بت جن کو انسان اپنے ہاتھ سے بناتا ہے اور یہ بادشاہ جو ہمیں جیسے انسان ہیں، خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟ جب میرا خالق اللہ ہے، وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے اور اسی کے ہاتھ میں میری زندگی اور موت ہے اور وہی میرے نفع و نقصان کا مالک ہے، یہ سوچنے کے بعد سیّدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے قطعی طور پر فیصلہ کر لیا کہ جن معبودوں کو میری قوم

پوجتی ہے ان کو میں ہرگز نہیں پوجوں گا اور اس فیصلہ کے بعد انہوں نے اپنی قوم سے علی الاعلان کہہ دیا:

﴿اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾

''جن معبودوں کو تم خدا کی خدائی میں شریک ٹھہراتے ہو، میں ان سے کامل بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔''

﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾

''میں نے سب درگاہوں سے منہ موڑ کر اس ذات پاک کی نیاز مندیوں اور عبادت گزاریوں کے لیے مخصوص کر دیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اب میرا مشرک قوم سے کوئی تعلق نہیں۔''

اس اعلان کے بعد سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام پر مصائب کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ باپ نے کہا: اگر تو اپنے عقیدے سے باز نہیں آتا ہے تو میرے گھر سے نکل جا، ورنہ میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ قوم نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کو قتل کر دینا چاہیے یا آگ کی چتا میں ڈال کر اسے بھسم کر دینا چاہیے۔ بادشاہ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو زندہ آگ میں جلا دیا جائے۔ مگر اللہ پر کامل یقین رکھنے والا ابراہیم (علیہ السلام) اس سزا کو بھگتنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔

بجرم عشق تو دم می کشند و غوغائیست
تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

جب اللہ نے اپنی قدرت سے اس کو آگ میں جلنے سے بچا لیا تو اپنے گھر بار، عزیز و اقارب، قوم اور وطن سب کو چھوڑ چھاڑ کر یہ کہہ کر ہجرت کی راہ اختیار کی:

﴿اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾

''میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ وہ سب پر غالب ہے اور اس کے سارے کام حکمت پر مبنی ہیں۔''

وطن چھوڑنے کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام شام، فلسطین، مصر اور عرب کے ملکوں میں پھرتے

رہے۔ آخر عمر میں جب کہ اولاد سے مایوسی ہو چکی تھی، اللہ نے اولاد دی۔ جب اولاد ملی تو اللہ کے اس وفادار بندے کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ جس مشن کو پھیلانے میں خود اس نے اپنی ساری عمر صرف کر دی، کس طرح اولاد کو اپنے بعد اپنے مشن کو جاری رکھنے کے لیے تیار کروں؟

امامتِ کبریٰ کی تاج پوشی:

اس ساری عمر کی اطاعت گزاریوں، وفا شعاریوں، فدائیت اور قربانیوں کے بعد ایک اور، مگر آخری قربانی یا آزمائش باقی رہ گئی تھی اور وہ امتحان یہ تھا کہ اس بڑھاپے میں جب کہ پوری مایوسی کے بعد اسے اولاد نصیب ہوتی ہے، اپنے اکلوتے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو اپنے معبودِ برحق کے لیے قربان کر سکتا ہے؟ چنانچہ یہ امتحان بھی لے لیا گیا۔ جب اس امتحان و آزمائش میں بھی سیّدنا ابراہیم علیہ السلام پورے اترے تب اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا کا فیصلہ صادر فرمایا کہ ہاں اب تم اس کے اہل ہو کہ تمہیں بنی نوع انسان کا امام بنایا جائے۔

عالمگیر تحریک اسلام کا مرکز:

جب سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی امامت سونپ دی گئی اور وہ اسلام کی عالمگیر تحریک کے امام بنا دیے گئے تو آپ نے اپنے بڑے صاحبزادے سیّدنا اسمٰعیل علیہ السلام کو حجاز میں مکہ کے مقام پر رکھا۔ اسی مقام پر باپ بیٹا دونوں نے دعوتِ اسلام کے لیے وہ مرکز تعمیر کیا جو کعبہ کے نام سے آج ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ عمارت عام مساجد کی طرح صرف عبادت گاہ نہ تھی بلکہ اوّل روز سے ہی اس کو دین اسلام کی عالمگیر تحریک کا مرکز قرار دیا گیا تھا تاکہ ایک خدا کی عبادت کرنے والے ہر جگہ سے کھنچ کھنچ کر یہاں جمع ہوا کریں۔ جمع ہو کر اللہ کی عبادت کریں اور اسلام کا پیغام لے کر پھر اپنے ملکوں کو واپس جائیں۔ یہی اجتماع تھا جس کا نام ''حج'' رکھا گیا۔

اسلام میں حج کی اہمیت:

آج سے ساڑھے چار ہزار برس پہلے سیّدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے جبل عرفات پر کھڑے ہو کر یہ منادی کی، اللہ کے بندو! اللہ کے گھر کی طرف آؤ۔ زمین کے ہر گوشے سے آؤ، نزدیک سے آؤ، دور دور سے آؤ، پیدل آؤ یا سواریوں پر آؤ، حج کے لیے آؤ اور ہر سال آؤ۔

اس کے جواب میں حرم پاک کا ہر مسافر بلند آواز سے کہتا ہے:

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ ، لَا شَرِيْكَ لَكَ .

''میں حاضر ہو گیا ہوں، میرے اللہ، میں حاضر ہو گیا ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہو گیا ہوں۔ ساری حمد و ثناء تیرے لیے ہے، ساری نعمتیں تیری طرف سے ہیں، یہ ملک سارا تیرا ہے اور کسی چیز میں تیرا کوئی شریک نہیں۔''

اس طرح لبیک کی ہر صدا کے ساتھ حاجی کا تعلق خاص توحید اور دعوت اسلام کی اس تحریک سے جڑ جاتا ہے جو سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور سیدنا اسمٰعیل ذبیح اللہ کے وقت سے چلی آ رہی ہے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساڑھے 4 ہزار برس کا فاصلہ بیچ سے مٹ گیا ہے اور اُدھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ کی طرف سے پکار رہے ہیں اور ادھر حاجی جواب دے رہا ہے۔ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ .

احرام:

یہ احرام کیا ہے؟ جس کے باندھتے ہی حاجی زیبائش و آرائش کی سب چیزیں اتار دیتا ہے اور ایک تہبند اور ایک چادر کے سوا کچھ نہیں پہنتا۔ یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا لباس ہے۔ ہر حاجی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سرزمین پر پہنچنے سے پہلے اس زائرانہ لباس کو پہنتا ہے، وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا ایک گدائے بے نوا ہو، سب ہی اس سادہ اور درویشانہ طرز کا لباس اختیار کرتے ہیں۔ سر کھلا رکھتے ہیں۔ خوشبو نہیں لگاتے، بال نہیں بناتے، ہر قسم کی زینت سے پرہیز کرتے ہیں۔ عورت مرد کا شہوانی تعلق ان دنوں میں معطل کر دیا جاتا ہے تاکہ دنیا اور اس کی لذتوں میں پھنسنے سے جو کچھ آلائشیں ہماری روح کو ملوث کر رہی تھیں وہ صاف ہو جائیں۔ کبر اور غرور کا لباس اتار دیا جائے اور خدا پرستی کی کیفیت ہمارے ظاہر اور باطن پر طاری ہو جائے۔

احرام باندھنے کے ساتھ ہی لبیک کی صدائیں تمام حجاج کی زبان سے بلند ہوتی ہیں۔ وہ ہر نماز کے بعد، ہر روز صبح نیند سے بیدار ہونے کے وقت، ہر قافلے سے ملتے وقت، ہر بلندی پر

چڑھتے اور ہر پستی کی طرف اترتے وقت بلند آواز سے پکارتے ہیں:

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ.

"میں حاضر ہوں، میرے اللہ میں حاضر ہوں، تیرے حکم کی تعمیل میں حاضر ہوں۔"

دیکھئے یہ کیسا عجیب منظر ہے۔ مختلف بولیاں بولنے والے، یہ اردو بولنے والے، یہ عربی، فارسی، یہ افغانی، یہ ترکی، یہ جاوی، یہ حبشی، یہ چینی، یہ روسی، یہ انگریزی بولنے والے، ایک ہی بولی بول رہے ہیں اور کس والہانہ انداز میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پکار اور تاجدارِ مدینہ کی دعوتِ حج پر صدائے لبیک بلند کر رہے ہیں۔ یہ بار بار کی صدائے لبیک، اس درویشانہ لباس کے ساتھ بکھرے ہوئے بال، غبار آلود چہرے اور دور دراز سفر کی تھکان کے ساتھ مل کر یقین جانیے ایسی کیفیت پیدا کر دیتی ہے کہ جس شخص کو یہ سعادتِ حج حاصل نہیں ہوتی، ہمارے الفاظ قاصر ہیں کہ اس کے سامنے اس کیفیت کی پوری تصویر کھینچ سکیں۔

حاجی اپنی نیاز مندیوں اور والہانہ عقیدت مندیوں کے ساتھ منزل بہ منزل کوچ کرتا ہوا جب اس مقام بیت اللہ پر پہنچتا ہے، جس کی طرف خلیل اللہ علیہ السلام نے دعوت دی تو وہ اس مقام کو چومتا ہے۔ پھر اس گھر کا طواف کرتا ہے جسے اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے مرکز قرار دیا تھا اور کئی بار طواف کرتا ہے اور اس بار بار کے چکر لگانے سے وہ عشق و محبت کی ایک پرانی رسم کو پورا کرتا ہے اور اس کے بعد مقامِ ابراہیم علیہ السلام پر سلامی کی دو رکعت ادا کرتا ہے۔ پھر یہاں سے نکل کر صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتا ہے اور اپنی اس عملی حالت سے اس کا اقرار کرتا ہے کہ یونہی اپنے مالک کے حکم کی تعمیل میں دوڑتا رہوں گا اور سعی و کوشش میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس کے بعد ہر حاجی کو پانچ چھ روز تک ایک کیمپ کی سی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ ایک دن منیٰ میں گزار کر دوسرے دن عرفات میں بسر کرتا ہے۔ عرفات میں سارا دن خدا کی حمد و ثناء اور دعا میں صرف کرتا ہے اور کیمپ کمانڈر یا امیر حج کا خطبہ سنتا ہے۔ احکام و ہدایات حاصل کرتا ہے اور ایک نئی زندگی حاصل کر کے لوٹتا ہے، رات مزدلفہ میں جا کر قیام کرتا ہے۔ دن نکلتے ہی منیٰ کی طرف کوچ کرتا ہے اور وہاں اس مقام پر کنکریوں سے چاند ماری کرتا ہے، جہاں تک اصحابِ فیل کی فوجیں کعبہ کو ڈھانے کے لیے پہنچ گئی تھیں۔ کنکریوں کی اس چاند ماری کا مطلب یہ ہے کہ

جو دشمن مسجدوں کو ویران کرنے اور اللہ کے دین کو مٹانے کے لیے اٹھے، اس کے مقابلہ میں لڑوں گا اور اگر جان کی قربانی دینی پڑی تو قربانی دوں گا۔ منیٰ میں قربانی دی جاتی ہے اور سیّدنا اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔

پھر یہاں سے حاجی مکہ شریف کی طرف مارچ کرتے ہیں۔ یہاں پر طواف اور دو رکعتوں سے فارغ ہو کر احرام کھول دیتے ہیں اور اب حاجی کی زندگی پھر معمول کے طور پر شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد حاجی پھر منیٰ کی طرف لوٹتا ہے اور تین دن وہاں کیمپ کرتا ہے۔ اسلام سے قبل عرب اس مقام پر جمع ہو کر اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرتے تھے اور دوسروں کی توہین و تذلیل کرتے تھے، جس کا نتیجہ اکثر جنگ و جدل ہوتا۔ اسلام نے اس آبائی منافرت کی بیہودگی کو خدا کی حمد و ثناء میں تبدیل کر دیا اور باہمی جنگ کی جگہ اقطاعِ ارض کے مسلمانوں کے باہمی تعارف و مؤدت، ہمدردی اور اخوت کے رشتہ کو مضبوط بنانے کا ذریعہ بنا دیا۔ منیٰ کے مقام کے بعد حاجی پھر مکہ کی طرف لوٹتا ہے اور بیت اللہ کا طوافِ وداع کر کے حج سے فارغ ہو جاتا ہے۔

جو کچھ میں نے مختصراً عرض کیا، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ فریضۂ حج جو اسلام کا چوتھا رکن ہے، اس میں عبادت اور ریاضت کے علاوہ سفر کے تجربے، قومی اور ملّی اجتماع کی برکات، ایثار و قربانی کے زبردست آثار کس طرح حاجی کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس وقت کی قربانی، مال کی قربانی آرام و آسائش کی قربانی، بہت سی دنیوی تعلقات کی قربانی، بہت سی نفسیاتی خواہشات کی قربانی ہے۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے ہے کہ اللہ کی رضا حاصل ہو اور اس کے عشق و محبت کی کیفیتوں کو اس طرح جسم و جاں پر طاری کر دے کہ اس کا ایک دیرپا نقش اس کے دل پر باقی رہے تاکہ برسوں اس مبارک سفر سے اسے ایک روشنی حاصل ہو جس سے وہ دنیا کی تاریکیوں کو دور کرتا ہے۔

حرم کی مقدس زمین پر پہنچ کر جب وہ ان مقامات کو دیکھتا ہے جہاں اللہ کے پیارے بندوں نے توحید کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مرکز قائم کیا اور اس کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کیں اور ہر اس باطل قوت سے ٹکرائے جو ان کی دعوت و تبلیغ کے راستے میں حائل ہوئی تو اسے ایمان کی پختگی اور تازگی حاصل ہوتی ہے۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

سیرۃ سیدنا ابراہیم علیہ السلام



دار الابلاغ
کتاب وسنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ
DARULIBLAGH